ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

NOV. DEC. - 1988

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۳ ——— شمارہ نمبر ۱۱—۱۲

نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء

• مدیر مسئول ——— نور محمد فلاحی

• مرتب ——— ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

• سالانہ زر تعاون	....	۳۰ روپئے
• خصوصی تعاون	....	۱۰۰ روپئے
• غیر ممالک سے	....	۱۵ امریکی ڈالر
• فی شمارہ	....	۳ روپئے
• اس شمارے کی قیمت		۶ روپئے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پرنٹرس ۱۲ ... پریس دہلی ——— کاتب: رفیق احمد شاہ پور، اعظم گڑھ

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ		
تعلیم و تربیت تو ہیں بس مثلِ جسم و جان	مرتب	۳
بحث و نظر		
قرآن کا تصورِ علم	ڈاکٹر سید مسعود احمد صاحب	۱۰
عورت کے چہرے کا پردہ	جناب محمد رفیق چودھری صاحب	۲۸
مقالات		
سیرتِ نبوی کے مصادر	انیس احمد فلاحی	۲۷
زبان و ادب کی ترقی میں قرآن کا رول	توقیر عالم فلاحی	۳۶
انبیائی اسلوبِ دعوت	عبدالودود متعلم جامعہ	۴۴
عظمت کے مینار		
حضرت عکرمہ ابن ابی جہل رضی اللہ عنہ	ابو جاوید	۱۸
تعلیم و تعلم		
امام سیوطیؒ اور "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور"	عبدالبر اثری فلاحی	۳۱
تنقید و تجزیہ		
ساری دنیا جو خفا ہے تو خفا رہنے دو	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۵۵
گوشۂ ادب		
پاکستان کا گمنام شاعر	ابو سفیان اصلاحی	۶۱
مراسلات		
ایک مراسلہ	فیاض احمد فلاحی	۶۵
تعارف و تبصرہ		
الحسنات کا "مولانا عبدالحیؒ" نمبر	تابش مہدی	۷۰
اخبارِ علمیہ		
عالمِ اسلام میں شریعتِ اسلامی......	ادارہ	۷۴
حلقۂ یاراں		
فقیر محمد، ضمیر نسوی		۷۶
جامعہ کے لیل و نہار		
ایک مذاکرہ	مرتب	۷۷

اداریہ

مرتب

تعلیم و تربیت تو ہیں بس مثلِ جسم و جان

ہندوستان کے نصابِ تعلیم اور طرزِ تعلیم کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی اہمیت و ضرورت پر بھی چند سطریں حوالۂ قرطاس کر دی جائیں تاکہ "تعلیم و تربیت کا باہمی ربط" واضح ہو جائے اور "تعلیمی میدان میں تربیت کے فوائد و اثرات" بھی سامنے آ جائیں۔

تربیت، عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں نشو و نما دینا اور مہذب بنانا۔ تہذیب کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو کاٹ چھانٹ کر درست کرنا اور موافق حال بنانا۔ مالی پھولوں کے پودوں کی نگرانی کرتا ہے۔ ان کی نشو و نما کے لئے محنت کرتا ہے، خون پسینہ ایک کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ٹہنیوں اور پتیوں کو کاٹ چھانٹ بھی سکتا ہے تاکہ اس کے بے ہنگم وجود کو درست کر سکے۔ مالی کی اس کوشش کا ثمرہ خوش رنگ، خوشبودار اور دلفریب پھولوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ سنار سونے کو بھٹی میں تپاتا ہے، اس کی ناہمواریوں کو اس سے جدا کرتا ہے اور پھر اسے کوٹ چھانٹ کر ایک خوشنما زیور کی شکل دے دیتا ہے کہ جسے ہر ایک پسند کرتا اور حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑھئی ایک موٹی و بدنما لکڑی پر محنت کرتا ہے۔ نہایت محنت و مشقت سے سے گھڑتا ہے جس کے نتیجے میں ایک عمدہ قسم کا فرنیچر تیار ہوتا ہے جسے استعمال کرنے کی خواہش بلکہ ضرورت ہر ایک کو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک مربی ایک بچے کی پرورش کرتا ہے۔ اس کی بری حرکتیں اس سے دور کرتا ہے۔ بسا اوقات اس میدان میں وہ اس کی سرزنش بھی کرتا ہے، ہر موقع سے اسے اچھی باتیں بتاتا ہے اور خیر خواہانہ جذبے کے ساتھ وہ اس کی اصلاح و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اس کوشش کے نتیجے میں وہ بچہ ایک صالح انسان بن جاتا ہے۔ اسی کا نام تربیت ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے تربیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ تربیت کا مقصد بھی انہی مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پھول کے پودے کی کاٹ چھانٹ، دیکھ ریکھ اور اس کی حفاظت کا مقصد یہ ہے کہ پودا رنگ برنگے اور خوشبودار پھول کھلائے جس سے دلفریبی کے ساتھ ساتھ خوشبو حاصل کی جا سکے۔

سنار سونے کو تپاتا اور اس میں نفاست کے ساتھ نقش و نگار بناتا ہے تاکہ وہ زیور، حسن و جمال میں مزید اضافے کا باعث بن سکے۔

بڑھئی لکڑی سے عمدہ قسم کا فرنیچر اس لئے تیار کرتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کیا جا سکے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی تربیت اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ ایک مومن کامل کی صورت میں تیار ہو جائے۔ لوگوں کو خوشبو کی طرح فائدہ پہنچائے۔ خود اپنے لئے اور اپنے دین کے لئے عزت و شرف اور عظمت و سربلندی کا ذریعہ بنے اور ہر ایک کو اپنی بہترین خصلتوں، نیک عادتوں اور عمدہ اخلاق سے فائدہ پہنچائے تاکہ آخرت کی زندگی میں سرخرو اور کامیاب ہو سکے۔

اسلام نے تعلیم کے ساتھ تربیت پر کافی زور دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ [1]

وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

یہاں ایک چیز "تعلیم کتاب و حکمت" ہے اور دوسری چیز "تزکیہ" ہے جو تربیت کے مفہوم میں بالکل واضح ہے یعنی ایک ایسا رسول جو لوگوں کی صحیح ڈھنگ سے تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ یہ اور اسی طرح کی متعدد قرآنی آیات تعلیم و تربیت کی اہمیت و

---

[1] سورۃ الجمعہ: آیت ۲

ضرورت پر دلیل ہیں۔ ایک موقع پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

وانما بعثت معلما۔ [1] — میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں

دوسرے موقع پر آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ [2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے تاکہ اخلاقی اچھائیوں کو تمام و کمال تک پہنچاؤں۔

ان دونوں احادیث میں جہاں ایک طرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو معلم کہا گیا ہے وہاں دوسری طرف مربی بھی کہا گیا ہے جس کو ہم ایک جملے میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی تعلیم و تربیت کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ علم دین کا حصول اور اس کے مطابق اپنی اور دوسروں کی تربیت، یہی ہمارا مقصد وجود ہے کہ اس کے بغیر دارین کی کامیابی ممکن نہیں۔

تعلیم و تربیت کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ وہ تعلیم، تعلیم ہی نہیں جس کے ساتھ تربیت نہ ہو یا یوں کہئے کہ تعلیم بغیر تربیت کے عبث ہے۔ تعلیم و تربیت گویا "علم و عمل" ہیں یعنی کسی چیز کی جانکاری تعلیم ہے اور اس پر عمل تربیت کا نام ہے۔ کسی شخص نے علم تو حاصل کر لیا لیکن اسے اپنی زندگی میں نافذ نہیں کیا یا اس کے مطابق اپنے آپ کی تربیت نہیں کی تو وہ عالم نہیں جاہل ہے بلکہ جاہل سے بھی بدتر ہے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت یعنی جانکاری کے ساتھ ساتھ اس پر عمل نہایت ضروری ہے۔ تعلیم ذریعہ ہے اور تربیت مقصد۔ اب اگر کوئی شخص ذریعہ تو حاصل کر لے لیکن مقصد تک رسائی نہ حاصل کر سکے تو اس سے بڑا احمق کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

---

[1] ابن ماجہ، ابو عبداللہ محمد بن یزید القزوینی۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱، المقدمۃ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ص۸۳۔

[2] امام مالک، موطا مالک، جلد ۳، باب ما جاء فی حسن الخلق ص۹۷۔

ہندوستان میں موجودہ تعلیمی اداروں کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱: خالص دنیوی۔ ۲: خالص دینی۔ ۳: دینی مگر دنیوی۔ ۴: دنیوی مگر دینی

ان درسگاہوں میں تعلیم تو دی جارہی ہے لیکن تعلیم کے ساتھ تربیت پر کس حد تک توجہ دی جاتی ہے، ہر ایک کو معلوم ہے۔

خالص دنیوی درس گاہوں میں تربیت نام کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ انھوں نے تعلیم و تربیت کو الگ الگ دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ انھیں صرف تعلیم سے مطلب ہے، تربیت سے کوئی سروکار نہیں۔

دنیوی مگر دینی درس گاہوں کی حالت بھی کچھ اسی طرح ہے۔ وہاں بھی تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ تعلیم کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور تربیت کو تعلیم سے علیحدہ تصور کیا جاتا ہے۔

بقیہ دو قسم کی درس گاہوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی اہمیت دی جاتی ہے بلکہ تربیت کو تعلیم کا جزء سمجھا جاتا ہے۔ خالص دینی درس گاہوں میں تربیت پر کافی زور دیا جاتا ہے لیکن ان کے یہاں تربیت کا دائرہ محدود ہوتا ہے جس کی وجہ سے کما حقہ تربیت کا حق ادا ہو نہیں پاتا۔

دینی مگر دنیوی درس گاہوں میں بھی تربیت کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اور مزید یہ کہ محدود دائرے سے نکل کر ایک وسیع پیمانے پر تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان دونوں قسموں کی درس گاہوں کا نظام تربیت اگرچہ مختلف ہے لیکن نتیجے کے اعتبار سے دونوں کی حالت یکساں ہے۔ عملی میدان میں ایک صالح نظام تربیت کا فقدان دونوں کے یہاں ہے۔

لیکن اس موقع سے بعض دینی مگر دنیوی درس گاہوں کے نظام تربیت کی تحسین نہ کرنا بجائے خود نہیں بلکہ حق تلفی ہوگی۔ وہ نظریاتی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی میدان میں بھی اپنے نظام تربیت پر کاربند ہیں۔ انھوں نے تربیت کو باقاعدہ ایک شعبے کی شکل دے رکھی ہے اور یہ شعبہ محض نام کا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ہر کام نہایت

نظم و انتظام کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ مزید یہ کہ یہ لوگ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہیں۔

اسلامی تربیت کا اجمالی خاکہ اور کچھ بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں:

ایمانی تربیت بچوں کی تربیت کا انتظام آغاز عمر ہی سے ہونا چاہئے۔ ایمانی تربیت میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہئے:

(۱) صغر سنی ہی میں لا الٰہ الا اللہ سکھانا (۲) حلال و حرام کی پہچان بتانا (۳) سات سال کی عمر میں عبادت کا حکم دینا (۴) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آل رسول سے محبت کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کی تاکید کرنا (۵) ایمان باللہ اور اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت کا یقین دل میں راسخ کرنا، عبادت و تقویٰ کو دل میں بٹھانا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حضوری کا تصور جاں گزیں کرنا۔

اخلاقی تربیت بچوں میں عموماً جھوٹ، چوری، گالم گلوج جیسی عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ اخلاقی تربیت کے اصول کچھ اس طرح ہونے چاہئیں:

(۱) اندھی تقلید سے روکنا (۲) عیش و عشرت اور ناز و نخرے کی زندگی سے پرہیز (۳) موسیقی اور فحش گانے سننے سے روکنا (۴) عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے سے روکنا (۵) بچے اور بچیوں کے اختلاط سے روکنا (۶) بچوں کو حسن اخلاق کی عادت ڈالنا اور دوسروں کے ساتھ نرمی کرنے اور حسن معاملہ کرنے کی تعلیم دینا۔

جسمانی تربیت جسمانی تربیت بھی نہایت ضروری ہے۔ صحت ایک عظیم نعمت ہے کہ اگر یہ نعمت اللہ تعالیٰ چھین لے تو زندگی اجیرن ہو کے رہ جائے۔

جسمانی تربیت کے اصول مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) پوری پوری غذا دینا (۲) صحت کے اصول کی اتباع (۳) متعدی امراض سے پرہیز (۴) مرض کا علاج کرنا اور اس کی طرف خصوصی توجہ دینا (۵) کھانے پینے میں احتیاط سے کام لینا کیونکہ بد احتیاطی سے مرض کے لاحق ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

(۶) ورزش کی عادت ڈالنا (۷) تنگ دستی کی زندگی گزارنے کی عادت ڈالنا اگر جہاد جیسے عظیم فریضے کی ادائیگی کی مشق ہو (۸) بچے کو بہادری کی عادت ڈالنا۔

عقلی تربیت

اصول یہ ہیں: ۱: تعلیم دینا۔ ۲: اسلامی فکر واضح کرنا۔ ۳: عقل کی سلامتی کا خاص خیال رکھنا (یعنی عقل کی حفاظت)

نفسانی تربیت

نفسانی تربیت نہایت ضروری ہے۔ اس کے اصول کچھ اس طرح ہیں:

۱: شرم کو دور کرنا۔ ۲: خوف کو دور کرنا۔ ۳: احساس کمتری ختم کرنا۔ ۴: حسد دور کرنا۔ ۵: غصے میں اعتدال سکھانا۔

معاشرتی تربیت

اسلام میں اجتماعی زندگی اور معاشرے کو ایک اہم مقام حاصل ہے لہذا بچے کی معاشرتی تربیت بھی نہایت ضروری چیز ہے اس کے اصول یوں ہیں:

۱: دل و دماغ کی تربیت اسلامی اصول پر کرنا (تقویٰ، اخوت، رحم، قربانی، عفو و درگزر اور جرأت وغیرہ) ۲: دوسرے لوگوں کے حقوق کا خیال رکھنا (خصوصاً والدین وغیرہ) ۳: اجتماعی آداب کا لحاظ رکھنا۔ ۴: ذہن کو اصلاحی بنانا کہ تخریب کو برداشت نہ کرسکے۔

جنسی تربیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جنسی جذبات بھی رکھے ہیں لہذا اس کی تربیت بھی ضروری ہے۔ اس کے اصول کچھ اس طرح ہونے چاہئیں:

۱: اجازت کے آداب (یعنی گھر وغیرہ میں داخل ہوتے وقت)۔ ۲: نگاہ ڈالنے کے آداب (بچوں کو کہاں کہاں نگاہ ڈالنی چاہئے اور کہاں کہاں نہیں)۔ ۳: جنسی جذبات کو بڑھانے والی چیزوں سے بچوں کو بچانا۔ ۴: بلوغت کے احکام کی تعلیم دینا (شادی کرنا وغیرہ)

یہ تھے کچھ بنیادی اصول۔ اگر توجہ و نیک نیتی کے ساتھ مندرجہ بالا اصولوں پر

بچوں کی تربیت کی جائے تو یقیناً اس کے بہترین نتائج سامنے آئیں گے

اس موقع سے مؤثر تربیت کے کچھ اصولی ذرائع کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ بنایا جائے (۲) بچوں کی تربیت عادت ڈلوا کر کی جائے یعنی ان کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کی عادت پڑ جائے (۳) نصیحت کے ذریعہ تربیت کرنا (۴) ہر وقت تاکید کے ذریعہ تربیت کرنا (۵) سزا کے ذریعہ تربیت کرنا۔

ان تمام ذرائع کا اپنی اپنی جگہ پر ایک وقت ہے جو اسی وقت میں مؤثر ثابت ہوں گے۔ مربی حضرات کو اس کا علم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مزید برآں مربی کے اندر مندرجہ ذیل صفات کا پایا جانا از حد ضروری ہے:

۱: اخلاص۔ ۲: تقویٰ۔ ۳: علم۔ ۴: حلم۔ ۵: احساس ذمہ داری۔ [۱]

تربیت کا میدان نہایت وسیع ہے۔ اس اداریے میں ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اہل علم حضرات کے مشوروں کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسلامی نظام تعلیم و تربیت کو استحکام بخشے، اس کی کمیاں دور کرے، جو ادارے اس سے محروم ہیں انھیں ایک صالح نظام عطا فرمائے اور جو لوگ اس نظام کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہیں انھیں اجر عظیم سے نوازے۔ آمین۔

واللہ ولی التوفیق

---

[۱] عبداللہ ناصح علوان۔ تربیۃ الاولاد فی الاسلام کی دونوں جلدوں سے یہ اصول مستفاد ہیں۔

قسط نمبر ۲

قرآن کا تصورِ علم

ڈاکٹر سید مسعود احمد صاحب

علم کی اہمیت

علم کی اہمیت کا اندازہ اس بات کی روشنی میں آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ نبی آخر الزماں محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی ہی میں خالقِ کائنات نے اپنے تعارف کے ساتھ علم کی اہمیت بیان فرمائی اور اس کے ذرائع کا مختصر تعارف بھی کرایا۔ (العلق ۱، ۳، ۵) اور اس نبیِ اُمّی (الجمعہ: ۲) کو کلمہ "اقراء" کے خلعتِ نبوت سے نوازا گیا جس نے کسی مدرسے یا کسی معلم سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ پانچ جملوں کی اس چھوٹی سی وحی میں دو بار پڑھنے (اقراء) اور تین بار جاننے (علم) کا ذکر فرمایا۔ مزید برآں اس کتابِ ہدایت کا اسمِ ذاتی ہی "قرآن" (الانعام: ۱۹)[1] یعنی پڑھی جانے والی چیز رکھا گیا اور اس کتاب کو العلم (البقرہ: ۱۲۰)[2] سے تعبیر کیا گیا۔ علم کی اہمیت اجاگر کرنے کی غرض سے اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے نام بھی قرآن کے لئے استعمال کئے گئے مثلاً حکمت (بنی اسرائیل: ۳۹، الاحزاب: ۳۴) ہدیٰ (البقرہ: ۲، ۹۷، ۱۸۵)[3] برہان (النساء: ۱۷۵)، کلام (التوبہ: ۶، الفتح: ۱۵) ذکر وغیرہ (الحجر: ۹)[4]۔ ظاہر ہے کہ یہ علم ہی کی مختلف شاخیں ہیں۔ قرآن نے معلمِ اول محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمیوں میں بعثت کا مقصد ہی یہ قرار دیا کہ وہ ان کے درمیان اللہ کی آیات کی تلاوت کریں،

---

[1] مزید دیکھیں یونس: ۳۷، یوسف: ۲، بنی اسرائیل: ۹

[2] نیز ملاحظہ ہو آلِ عمران: ۶۱، الرعد: ۳۷

[3] مزید دیکھیں آلِ عمران: ۳۸، المائدہ: ۴۶، الانعام: ۱۵۷، القصص: ۴۳

[4] مزید دیکھیں الکہف: ۲۸، الانبیاء: ۵۰، یوسف: ۱۰۴، الطلاق: ۱۰

علم و حکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں۔ (آلِ عمران: ۱۶۴)[5]

اسلام نے لوح (البروج: ۲۱، ۲۲) اور قلم (القلم: ۱) کا تصور دیا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور قوانین محفوظ کی جاتی ہیں۔ یہ تصور آپ کو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملے گا۔ علاوہ بریں ام الکتاب (الزخرف: ۴)[6] اور کتابِ مبین (یونس: ۶۱)[7] کی شکل میں زمین و آسمان کے جملہ علوم پر حاوی کتاب کا تصور بھی قرآن ہی کی دین ہے۔ اسی اسلامی تصور کو مستعار لے کر دنیا میں انسائیکلوپیڈیا کا خیال پیدا ہوا جسے اس ام الکتاب سے نسبت قطرہ اور سمندر کی بھی شاید نہ ہو۔

آخر کوئی وجہ ہی تو تھی جس کی بنیاد پر اس علیم و بصیر ذات نے "قلم" اور جو کچھ لکھا جا رہا تھا اس کی قسم کھائی اور ایک سورہ کا نام ہی قلم رکھوا دیا (القلم) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک "علیم" فرزند کی بشارت دی گئی (الذاریات: ۲۸، الحجر: ۵۳) اس نعمتِ خداوندی کا اندازہ اس آیتِ پاک سے بھی لگایئے کہ جس میں نبی اکرمؐ کو منعمِ حقیقی نے حکم دیا کہ آپ ہم سے علم میں اضافے کی دعا مانگئے۔ (طٰہٰ: ۱۱۴)

قرآن کا علمی طرزِ استدلال تو ہر قاری پر روزِ روشن کی طرح ہر صفحۂ قرآن سے عیاں ہو ہی جاتا ہے جس کی تردید اسلام کے دشمن بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارا مقصد تو یہاں اس کے ذخیرۂ دلائل میں سے چند ایک کے ذریعے علم کی اہمیت بیان کر دینا ہے۔ خود قرآن نے کہ قرآن ایک جگہ بایں الفاظ اپنے استدلال کی بنیاد رکھتا ہے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں فرماتا ہے کہ تمہیں علم نہ ہو تو اہلِ علم سے پوچھ لو (الانبیاء: ۷، النحل: ۴۳) مشرکین کے لایعنی رسوم و رواج اور بے سروپا عقائد کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ لوگ ظن و تخمین کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کے پاس ان غلط عقائد کا علم

---

[5] مزید دیکھیں الجمعہ: ۲، البقرہ: ۱۵۱

[6] مزید دیکھیں الرعد: ۳۹، فاطر: ۱۱

[7] مزید دیکھیں ہود: ۶، الانعام: ۳۸، النحل: ۸۹

کوئی علمی سند جواز نہیں۔ (النساء: ۱۵۷) ایک مقام پر ان کے سامنے یہ چبھتا ہوا سوال بھی پیش کر دیا گیا کہ کیا یہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید تب بھی کرتے رہیں گے جب کہ ان کے بزرگ نہ کوئی علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔ (المائدہ: ۱۰۴) پر زور علمی استدلال کی ایک ناقابلِ تردید دلیل بھی ملاحظہ ہو جس میں ارشاد فرمایا گیا کہ اگر تمہارے پاس کوئی علم ہو تو ہمارے سامنے لاؤ۔ (الانعام: ۱۴۸)

اجتماعی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ قیادت کا ہوتا ہے۔ قرآن قیادت کی اہلیت کے لئے علم کی برتری قائم رکھتا ہے۔ (البقرہ: ۲۴۷) معاشرتی معاملات میں اس کی ہدایت ہے کہ آپس میں لین دین، قرض اور معاملات کو ضبط تحریر میں لے آؤ اور لکھنے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ لکھنے سے پہلو تہی نہ کیا کریں۔ (البقرہ: ۲۸۲) علم کی فضیلت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ رب العلمین نے سرورِ کائنات کو یہ حکم دیا کہ آپ ان لوگوں کی خواہشات پر نہ چلیں جن کو علم نہیں۔ (الجاثیہ: ۱۸) اور جاہلوں سے اعراض کریں۔ (الاعراف: ۱۹۹) حضور اکرمؐ کے توسط سے عام لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کا پیچھا نہ کیا کرو کیونکہ کان، آنکھ اور دل و دماغ کے معاملہ میں ہر شخص سے پوچھ گچھ ہوگی۔ (بنی اسرائیل: ۳۶) اگرچہ علم حاصل کرنا تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے اور اس کا اہتمام کرنا ریاست کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس حکم پر عمل درآمد کی صورت ایسی تجویز کی گئی ہے کہ ذوقِ علم کے اہتمام کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی دوسری سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ سارے کے سارے بیک وقت تحصیلِ علم کے لئے نکل کھڑے ہوں۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ اُن کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل آئیں اور دین کی سمجھ پیدا کرنے کے بعد واپس جا کر اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں تاکہ وہ اللہ کی نافرمانی سے بچا کریں۔ (التوبہ: ۱۲۲)

علم کی قوت

علم کی قوت اس واقعہ سے بھی اجاگر ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ایک طاقتور جن نے ملکہ سبا کے تخت کو سیکڑوں میل سے ان کے دربار کی برخاستگی سے قبل لانے کی پیش کش کی تو ایک شخص نے جسے

علم کتاب سے نوازا گیا تھا، اس جن کو چیلنج کر دیا اور کہا کہ میں اس تخت کو پلک جھپکنے سے قبل لا سکتا ہوں۔ اتنا کہتے ہی وہ تخت حضرت سلیمان کے سامنے تھا۔ (النمل: ۴۰) نزولِ قرآن کے وقت قرآن کا پیش کردہ یہ واقعہ بے شک ایک ناقابلِ تصور عجوبہ تھا۔ مگر آج انسان کے علم و عقل کے مظاہر راکٹ، ہوائی جہاز، بجلی، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ایٹمی اور نیوکلر مشینوں وغیرہ کی موجودگی میں یہ واقعہ اب ناممکنات کی سرحد سے نکل کر ممکن الوقوع ہو گیا ہے بس فرق اتنا ہی ہے کہ ہمارے سائنس دان علم ظاہر سے تو بے شک بہرہ ور ہیں مگر علم من الکتاب (النمل: ۴۰، الرعد: ۴۳) کی ناپید کنار قوتِ تسخیر سے نابلد ہیں۔ اسی وجہ سے ایسے ناممکن الوقوع واقعات تک کو غیر سائنٹیفک کہہ کر رد کر دینے میں انھیں تامل نہیں ہوتا۔ یہ خود ایک غیر سائنٹیفک انداز ہے جس سے علم کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

علم کی اقسام

مختلف پہلوؤں سے علم کی متعدد اقسام ممکن ہیں۔ ہم یہاں چند نمایاں پہلوؤں کی روشنی میں بحث کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبلی اور شعوری (البقرہ: ۳۱[1]) دونوں قسم کے علوم سے نوازا ہے جن کو وہبی اور کسبی علوم کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ وہبی علوم کے ذیل میں علم نبوت و معرفت (مریم: ۴۳، ۵۱، ۵۴[2]) علم لدنی (الکہف: ۶۵) علم فجور و تقویٰ (الشمس: ۸) وغیرہ رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ علوم براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو پہنچتے ہیں۔ ان علوم میں انسانی کسب و ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ الہام و مکاشفہ اور رؤیا کو وہبی علوم میں رکھنا بحث طلب مسئلہ ہے جوگیوں اور مشقوں سے بھی اسی قسم کا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان خوارقِ عادات میں انسانی کسب و ارادہ اور القاء شیطانی کا بہت امکان ہے۔ علم وحی، علم لدنی وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی حفاظت کا ذمہ ہے لہٰذا یہ شیطانی حربوں سے پاک ہیں۔ (الجن: ۲۶ تا ۲۸)

---

[1] مزید دیکھیں العلق: ۴، ۵۔ الشمس: ۸

[2] مزید دیکھیں الاعراف: ۱۵۸۔ الزخرف: ۶

علومِ کسبی حواسِ خمسہ کے ذریعے یا کچھ آلات کی مدد سے نیز دو انسانوں کے تعامل یا انسان و کائنات کے تعامل سے انسانی عقل و شعور اور محنت و مشقت کے مطابق ملتے ہیں۔ عقل و شعور سے یہاں ہماری مراد قوتِ استنباط ہے جو سراسر عطیۂ خداوندی ہے۔ ان علوم کے قرآنی ماخذ اور ذرائع کان، آنکھ، فواد (بنی اسرائیل: ۳۶، المومنون: ۷۸) غور و فکر،[1] سیر و سیاحت مع الفکر (العنکبوت: ۲۰)[2] قصص و تاریخ سے عبرت پذیری (الاعراف: ۱۷۶) وغیرہ ہیں۔[3]

کسبی علوم کے دنیا پر اثرات کی نسبت سے مزید تین قسمیں کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ علومِ خیر مثلاً قرآن و حدیث کا علم یعنی علومِ نبوت کو صاحبِ وحی سے بالواسطہ یا براہِ راست حاصل کرنا۔ ان کو علومِ محمود بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان علوم کا حاصل کرنا فرضِ عین اور ان میں دسترس حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے۔

۲۔ علومِ فتنہ جن میں تمام دنیوی علوم آ جاتے ہیں۔ نیز علومِ خیر کو بدنیتی سے حاصل کرنا یا ان کے معانی و مفاہیم میں افراط و تفریط سے کام لینا بھی فتنہ کا موجب بن جاتا ہے۔ گویا ہر علم موجبِ فتنہ اور ذریعۂ آزمائش ہے البتہ اس کے حاصل کرنے میں خیر و شر اس بات پر منحصر ہے کہ طالبِ علم اور صاحبِ علم اسے کس نیت سے اور کس مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

۳۔ علومِ شر مثلاً سحر، علمِ نجوم، علمِ قیافہ وغیرہ۔ ان کو سیکھنا یکسر ناجائز ہے۔ اور یہ علوم مذموم ہیں کیونکہ یہ شیطان کے افکار کا نتیجہ ہیں اور انہی کے حواریوں کے ذریعے فروغ پاتے ہیں۔ نیز دنیا میں فساد کا باعث بنتے ہیں۔

علم کے حصول و استعمال کیلئے بنیادی ہدایتیں

اسلام نے ہمارے خیال میں علم کے لئے چار بنیادیں فراہم کی ہیں۔ توحید، رسالت، آخرت اور خلافت۔

۱؎ حٰم السجدہ: ۵۳، ۴م - الذاریات: ۲۰ تا ۲۲ - البقرہ: ۱۶۴ - آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱ - الاعراف: ۱۸۵

۲؎ الحج: ۴۶ - فاطر: ۴۴ - الروم: ۹، ۴۲ - مومن: ۲۱ - الانعام: ۱۱

۳؎ المائدہ: ۲۷ تا ۳۱ - ہود: ۱۰۰ - یوسف: ۳، ۱۱۱

علم کا توحیدی نظریہ یہ ہے کہ تمام علوم کا حقیقی سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔ (العلق: ۴، ۵ - الرحمٰن: ۲) اس نے تسخیر کرنے کی خاطر ہی تمام علوم کو ظہور بخشا ہے۔ لہٰذا علوم کو حاصل کرنے کا مقصد صرف معرفتِ خداوندی اور خشیتِ الٰہی پیدا کرنا (فاطر: ۲۸)[1] اور انسانوں کی فلاح اور کائنات کے توازن و تعمیر کیلئے استعمال کرنا ہے۔ یہ استخراج وحدتِ الٰہ (البقرہ: ۱۶۳)[2] وحدتِ انسانیت (الحجرات: ۱۳)[3] اور وحدتِ علم (العلق: ۴، ۵)[4] اور وحدتِ کائنات (الملک: ۳)[5] پر منتج ہوتا ہے اور یہی قرآن کا جامع تصور ہے۔ بالفاظِ دیگر توحیدی نظریۂ علم کی رو سے علم کا ابتدائی سرا اللہ کی ذات اور آخری سرا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے یعنی اس کی معرفت حاصل کرنا اور اس کی تخلیقات میں نظامِ خداوندی کو قائم رکھنا۔

رسالت کا عقیدہ علم کے سلسلہ میں یہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست علم دیا اور اس علمِ حقیقی و یقینی کو بذریعہ وحی بھیجا (الاعراف: ۳۵)[6] رسول ہی سفرِ حیات میں سیدھے راستہ کی راہنمائی کر سکتا ہے (الاعراف: ۳۵)[7] علمِ نبوت ہی حق اور لاریب ہے۔ (الاعراف: ۲۳ - النحل: ۷۵) یہ عقیدہ تمام علومِ دنیوی اور علومِ اخروی، علومِ ظاہر اور علومِ باطن، علومِ طبیعیات اور علومِ مابعد الطبیعیات وغیرہ کو علمِ وحی کے تابع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی رو سے علمِ حقیقی براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے جبکہ انسان اپنی طرف سے تخمین و ظن اور ضد و تعصب کی بنیاد پر بہت سے فلسفے اور راستے متعین کر لیتا ہے (النحل: ۹) اور ان بے لگام کسبی علوم کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد کا موجب بنتا ہے۔ (الروم: ۴۱)

۱؎ نیز ملاحظہ ہو بنی اسرائیل: ۷۰ - الحج: ۵۴

۲؎ مزید ملاحظہ ہو النساء: ۱۷۱ - یوسف: ۳۹ - الرعد: ۱۶ - ابراہیم: ۴۸

۳؎ مزید دیکھیں البقرہ: ۲۱۳ - النساء: ۱   ۴؎ مزید ملاحظہ ہو الرحمٰن: ۲

۵؎ مزید دیکھیں الانعام: ۷۰ - الانبیاء: ۳۳

۶؎ مزید دیکھئے ہود: ۲۸ - النحل: ۲

۷؎ ایضاً

یہ رسول ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون سا علم محمود ہے اور کون سا مذموم، بلکہ رسول کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ حکمت و بصیرت کی باتیں سکھائے (آلِ عمران: ۱۶۴) اور حق و ناحق کے درمیان تمیز کر دے نیز بُرے اعمال کے بُرے اور اعمالِ حسنہ کے بہترین نتائج سے انسانوں کو آگاہ کر دے۔ (الکہف: ۵۶)

رسالت کے ضمن میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ مکمل کر دیا ہے[1] اور شریعتِ محمدی کی یہ خصوصیت ہے کہ ہدایت کے باب میں یہی عالمگیر قانونِ حیات ہے اور نبی کریم ہی تمام عالم کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔[2]

آخرت کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے کسب کا خود ذمہ دار ہے۔ (البقرہ: ۱۳۴)[3] اس کو اپنے علم و عمل کا ایک روز حساب دینا ہے۔ (الاعراف: ۶)[4] لہٰذا ہر علم کو اخروی فلاح کی نیت سے حاصل کرنا چاہئے اور اس کا استعمال بھی اسی راہ میں ہونا چاہئے جس میں فلاحِ آخرت کی ضمانت ملتی ہو۔ اسلام میں فلاحِ آخرت کی بنیاد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر رکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ علم کو معرفتِ خداوندی اور احکامِ خداوندی کی بجا آوری کے لئے حاصل کیا جائے اور اللہ کے بندوں کا یہ حق ہے۔ ہر علم کے حصول و استعمال کا مقصد تعمیرِ انسانیت، بہبودِ خلائق اور معاشرہ میں عدل و انصاف کا قیام ہو۔

منکرینِ آخرت اور مومنین میں علم کے پہلو سے ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ منکرینِ آخرت دنیوی کامیابی اور مفاد کے لئے علم حاصل کرتے ہیں اور وہ علمِ ظاہر یعنی علومِ مادی سے آگے نہیں بڑھتے جبکہ فلاحِ آخرت کے لئے علومِ غیب اور علومِ روحانی کی بھی ضرورت ہے۔

---

۱ المائدہ: ۳

۲ الاعراف: ۱۵۸ ۔ الانبیاء: ۱۰۷

۳ یونس: ۴۱ ۔ القیامۃ: ۳۶ ۔ بنی اسرائیل: ۱۵، ۳۶ ۔ الاعراف: ۶

۴ الانبیاء: ۴۷ ۔ الزلزال: ۷، ۸ ۔ البقرہ: ۲۸۴ ۔ النجم: ۳۹، ۴۰

خلافت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے (البقرہ: ۳۰)[1] وہ امانتِ الٰہی کا حامل ہے (الاحزاب: ۷۲) اس کو خلافتِ ارضی کی گوناگوں ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے ہی علم عطا ہوا ہے (البقرہ: ۳۰، ۳۱) وہ اشرف المخلوقات ہے۔ (ص: ۷۵)[2] اور تسخیرِ کائنات کا اہل ہے۔ (لقمان: ۲۰)[3] اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کائناتی علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ (حم السجدہ: ۵۳ ۔ العنکبوت: ۲۰) اسے علم و بصیرت، حکمت اور تعقل جیسی صفات اسی لئے عطا کی گئی ہیں کہ وہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری و نافذ کرے۔ ارتقاءِ خودی اور کائنات و انسان کے درمیان بہترین ہم آہنگی کے اصولوں پر علوم کی بنیادیں قائم کرنا ہی خلیفۂ ارضی کے شایانِ شان ہے۔

علم کے اسلامی اور غیر اسلامی تصورات میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اسلام علم کے دونوں سرے (ENDS) اور اس کی سمت متعین کرتا ہے جب کہ غیر اسلامی نظریات میں نہ علم کے متعین کنارے ہیں اور نہ حقیقی فلاح کی جانب سمتِ سفر۔ "علم برائے علم" اور "ہر علم محمود و مستحسن" ان کے نعرے ہیں۔

مندرجہ بالا اسلامی بنیادوں کی روشنی میں، قرآنی اقدار سے مزین اور علمِ وحی سے سیراب و مستفاد علم "العلم" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ورنہ قرآن مجید علم کو سندِ عظمت عطا نہیں کرتا[4]۔ چنانچہ اس کے نزدیک اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ تحصیلِ علم اور علم کا استعمال دونوں صحیح ہوں۔

(جاری)

---

۱ مزید ملاحظہ ہو الانعام: ۱۶۵ ۔ فاطر: ۳۹

۲ ملاحظہ ہو البقرہ: ۳۴ ۔ بنی اسرائیل: ۷۰ ۔ التین: ۴

۳ مزید ملاحظہ ہو الجاثیہ: ۱۳ ۔ النحل: ۱۲، ۱۴

۴ مزید دیکھیں البقرہ: ۲۱

حضرت عکرمہ ابن ابی جہل رضی اللہ عنہ

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا ——— ترجمانی: ابو جاوید

اس وقت وہ اپنی عمر کی تیسری دہائی میں تھے جب نبی رحمت صلے اللہ علیہ وسلم نے حق و ہدایت کی دعوت کا برملا اظہار کیا تھا۔ وہ حسب و نسب کے اعتبار سے قریش کے معزز ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ان میں سب سے فائق تھے اگر ان کا باپ آڑے نہ آتا تو وہ اس لائق تھے کہ اپنے ہم عمروں، سعد بن ابی وقاص اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کی طرح بہت پہلے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہوتے۔

قارئین کرام کو معلوم ہے کہ ان کا باپ کون تھا؟ وہ مکہ کا سب سے سرکش اور جابر شخص، شرک و کفر کا قائد و سالار اور مسلمانوں کی ابتلاء و آزمائش کا سب سے بڑا ذمہ دار تھا جس کی سخت گیری اور اذیت کوشی کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کے ایمان کی آزمائش کی اور وہ اس میں ثابت قدم رہے۔ جس کی مکاری اور چالبازی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان و یقین کو پرکھا اور وہ اس معیار پر کھرے اترے۔ اس کے متعلق بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ "ابو جہل" تھا۔

یہ تو ان کا باپ تھا اور وہ خود عکرمہ ابن ابی جہل مخزومی ہیں۔ عکرمہ کا شمار قریش کے معدودے چند سربرآوردہ رئیسوں اور اس کے نامور شہسواروں میں ہوتا تھا۔

عکرمہ ابن ابی جہل نے خود کو اس حال میں پایا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے مطابق محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ اس نے ان کے ساتھ سخت عداوت کا رویہ اختیار کیا۔ ان کے ساتھیوں کو دردناک سزائیں دیں اور اہل اسلام پر ایسی زہرہ گداز عقوبتیں نازل کیں کہ اس کے باپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔

جب اس کے باپ نے معرکۂ بدر میں لشکر شرک کی قیادت کی اور لات و عزیٰ کی

قسمیں کھا کھا کر اعلان کیا کہ محمدؐ کو شکست دیئے بغیر وہ مکہ واپس نہیں لوٹے گا۔ اس نے بدر کے مقام پر پڑاؤ ڈال کر وہاں تین دن قیام کیا۔ اس دوران وہ اونٹ ذبح کر کے ان کا گوشت کھاتا اور شراب پیتا رہا۔ اس کی دلبستگی کے لئے دف بجا بجا کر لونڈیاں نغمے گاتی رہیں۔ جس وقت ابو جہل اس معرکے کی قیادت کر رہا تھا اس کا بیٹا اس کا قابل اعتماد دست و بازو تھا لیکن لات و عزیٰ نے نہ اس کی پکار سنی نہ اس کی مدد کو آئے کیونکہ وہ سننے سے معذور اور مدد کرنے سے عاجز تھے۔ تو وہ ذلت کی موت مارا گیا اور اس کے بیٹے نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پیاسے نیزے اس کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس نے اپنے کانوں سے اس کے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ سنی تھی۔

عکرمہ بدر کے میدان میں قریش کے اس عظیم سردار کی لاش چھوڑ کر مکہ لوٹ آیا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد اس کے لئے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ وہ اپنے باپ کی لاش اٹھا کر لاتا اور اسے مکہ میں دفن کرتا۔ راہ فرار اختیار کرتے ہوئے وہ بادلِ ناخواستہ اسے مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا اور مسلمانوں نے دوسرے مقتولین کے ساتھ اسے بھی بدر کے کنوئیں میں پھینک کر اس پر ریت ڈال دی اور اسی روز سے اسلام کے ساتھ عکرمہ کے رویے نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ پہلے تو وہ اپنے باپ کی حمایت میں اسلام کا مخالف تھا مگر آج سے اس کے انتقام کے لئے اس سے برسرپیکار ہو گیا اور یہیں سے عکرمہ اور اس کے دوسرے ہم خیال مشرکین قریش جن کے آباء جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور وہ ان کے انتقام کی آگ میں جل رہے تھے، اہل مکہ کے سینوں میں محمدؐ کے خلاف عداوت کی آگ اور انتقام کے شعلے بھڑکانے میں لگ گئے جس کے نتیجے میں احد کا خونریز معرکہ پیش آیا۔

جنگ بدر میں اپنی شکست کا بدلہ اور اپنے مقتولین کا انتقام لینے کے لئے قریش کا جو لشکر جرار مکہ سے روانہ ہوا، عکرمہ اس میں شریک ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی ام حکیم کو بھی ساتھ لیا تاکہ وہ ان عورتوں کے ساتھ شامل ہو کر صفوں کے پیچھے کھڑی ہو جائے اور جب جانبازان قریش میں شکست کے آثار نظر آئیں تو وہ دف بجا بجا کر انھیں

قوان پر برانگیختہ کریں اور ان کو میدانِ جنگ میں ثابت قدم رکھنے کی کوشش کریں۔

قریش نے اپنی فوج کے گھڑسوار دستے کی قیادت کے لئے اس کے میمنہ پر خالد بن ولید اور میسرہ پر عکرمہ ابن ابی جہل کو متعین کیا۔ اس روز ان دونوں مشرک سالاروں نے جرأت و شجاعت اور مردانگی و جوانمردی کے ایسے جوہر دکھائے کہ قریش کا پلہ محمدؐ اور ان کے اصحاب پر بھاری ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں وہ فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے جس پر ابوسفیان فرطِ مسرت سے چیخ اٹھا تھا "یہ جنگِ بدر کا بدلہ ہے۔"

غزوۂ خندق کے موقع پر مشرکین نے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ جب محاصرے نے کافی طول کھینچا تو عکرمہ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ محاصرے کی طوالت سے بددل ہو گیا۔ آخر اس نے خندق کے ایک تنگ حصے کو تاکا اور اپنا گھوڑا کُدا کر اس پار جا پہنچا۔ کچھ جری سواروں نے اس کی اقتدا کی اور وہ بھی اس کے پیچھے خندق عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ ان میں سے عمرو بن عبدود مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا لیکن عکرمہ نے راہِ فرار اختیار کی اور وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

اور فتح مکہ کے موقع پر جب قریش نے دیکھا کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب کے سامنے ان کو تابِ مقاومت نہیں ہے تو انھوں نے طے کیا کہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں۔ یہ فیصلہ انھوں نے اس لئے کیا کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کے سالاروں کو یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ مکہ کے عام باشندوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ وہ صرف انہی لوگوں سے جنگ کریں جو ان سے لڑیں۔ لیکن عکرمہ اور اس کے کچھ ہم خیال ساتھی قریش کے اس فیصلے کے علی الرغم جنگ کا ارادہ لے کر مکے سے نکل پڑے اور مسلمانوں کے لشکرِ جرار کے سامنے جا ڈٹے۔ لیکن حضرت خالد بن ولید نے ایک مختصر جھڑپ کے بعد انھیں شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس جھڑپ میں ان کے چند آدمی مارے گئے اور باقی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مفرورین میں عکرمہ ابن ابی جہل بھی تھا۔ اس وقت وہ سخت حیرانی و سراسیمگی سے دوچار تھا۔ اہلِ مکہ کے مسلمانوں کے سامنے سرنگوں ہو جانے کے بعد اس کے لئے وہاں کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کے

ان تمام جرائم کو معاف کر دیا تھا جو انھوں نے آپؐ کے مقابلے میں کئے تھے۔ البتہ اس عام معافی سے چند مجرموں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا اور نام لے لے کر حکم دیا گیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے خواہ وہ غلافِ کعبہ میں چھپے ہوئے ہی کیوں نہ ملیں۔ ان لوگوں میں عکرمہ ابن ابی جہل کا نام سرفہرست تھا۔ اس لئے اپنی جان کے خوف سے وہ چھپ کر مکہ سے نکلا اور یمن کی طرف چل پڑا کیونکہ اس کے علاوہ اسے کسی دوسری جگہ پناہ ملنے کی امید نہ تھی۔

عکرمہ کی بیوی ام حکیم اور ہند بنت عتبہ دس دوسری عورتوں کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے ارادے سے آپؐ کی قیام گاہ پر پہنچیں۔ اس وقت دو ازواجِ مطہرات، آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور خاندانِ عبدالمطلب کی چند خواتین آپ کے پاس موجود تھیں۔ اس موقع پر ہند نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے پسندیدہ دین کو غالب کر دیا۔ میں آپ کے ساتھ اپنی نسبی اور خاندانی قرابت کا واسطہ دے کر آپ سے خیر اور حسنِ سلوک کی خواستگار ہوں۔ میں آپ کی تصدیق کرنے والی ایک مسلمان عورت ہوں۔" پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب سرکاتے ہوئے کہا: "اللہ کے رسولؐ! میں عتبہ کی بیٹی ہند ہوں۔" تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا:

"میں تمہیں مرحبا کہتا ہوں اور تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

اس نے پھر کہا:

"بخدا اے اللہ کے رسولؐ! آج سے پہلے روئے زمین پر کوئی ایسا گھر نہ تھا جس کی ذلت و رسوائی مجھے آپؐ کے گھر کی ذلت و رسوائی سے زیادہ پسند ہو۔ مگر اب یہ حال ہے کہ دنیا کا کوئی گھر میرے نزدیک آپؐ کے گھر سے زیادہ معزز نہیں ہے۔"

اس کے بعد عکرمہ کی بیوی ام حکیم کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلے تو اپنے اسلام کا اظہار کیا پھر یوں گویا ہوئی:

"اے اللہ کے رسولؐ! عکرمہ اس خوف سے بھاگ گئے ہیں کہ آپ انھیں قتل کر دیں گے۔

اللہ کے رسول! آپ انھیں امان بخش دیں اللہ آپ کو امان دے گا۔"

آپ نے اس کی درخواست سن کر ارشاد فرمایا: "عکرمہ ابن ابی جہل کو امان دی جاتی ہے۔"

شوہر کی جاں بخشی کا اعلان سن کر ام حکیمؓ اسی وقت اپنے رومی غلام کو ساتھ لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑیں۔ جب وہ دونوں چلتے چلتے دور نکل گئے تو دوران سفر غلام کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے ان کے اوپر ڈورے ڈالنا شروع کر دیئے۔ وہ اسے امید دلاتی اور ٹالتی ہوئی عرب کے ایک قبیلہ میں پہنچ گئیں۔ وہاں پہنچ کر اہل قبیلہ سے مدد کی طالب ہوئیں اور اہل قبیلہ نے غلام کو اپنے پاس قید کر دیا اور ام حکیمؓ نے تن تنہا اپنا سفر جاری رکھا اور آخر کار تہامہ کے علاقے میں سمندر کے کنارے عکرمہ کو پا گئیں۔ اس وقت وہ ایک مسلمان ملاح سے گفتگو کر رہا تھا کہ وہ اسے اس پار پہنچا دے۔ مگر ملاح اس بات پر مصر تھا کہ پہلے تم اخلاص کا اظہار کرو تب میں تم کو اس پار لے جاؤں گا۔ عکرمہ نے پوچھا کہ میں اخلاص کا اظہار کس طرح کروں؟ تو اس نے کہا کہ کہو "اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدا رسول اللّٰہ"

عکرمہ نے جواب دیا کہ "اسی سے بھاگ کر تو میں یہاں آیا ہوں......" ابھی ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ام حکیم عکرمہ کے پاس پہنچ گئیں۔ اور اس سے بولیں:

"میرے ابن عم! میں تمہارے پاس سب سے افضل، سب سے نیک اور سب سے اچھے انسان کی طرف سے آئی ہوں۔ میں تمہارے پاس محمدؐ بن عبداللہ کی طرف سے آئی ہوں میں نے ان سے تمہاری جاں بخشی کا وعدہ لے لیا ہے۔ تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

عکرمہ نے پوچھا کہ "کیا تم نے خود ان سے بات کی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "ہاں! میں نے خود بات کی ہے اور انھوں نے تم کو امان دی ہے۔"

وہ برابر اس کی جاں بخشی کا یقین دلاتی رہیں یہاں تک کہ وہ مطمئن ہو گیا اور ان کے ساتھ واپس پر رضامند ہو گیا۔ دوران راہ انھوں نے غلام کی اس خباثت نفس کا ذکر کیا جو اس نے سفر کے دوران کیا تھا اور عکرمہ نے مسلمان ہونے سے پہلے وہاں پہنچ کر اسے قتل کر دیا۔

دوران سفر میں جب وہ دونوں ایک منزل پر رکے تو عکرمہ نے بیوی سے خلوت کی خواہش ظاہر کی لیکن، انھوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک مسلمان عورت ہوں اور تم ابھی مشرک ہو۔"

عکرمہ نے اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"وہ بات جو تمہیں میرے ساتھ خلوت سے روک دے، یقیناً کوئی نہایت ہی بات ہوگی۔"

جب عکرمہ مکے کے قریب پہنچا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

"یأتیکم عکرمۃ بن ابی جہل مؤمنا مہاجرا فلا تسبوا اباہ فان سب المیت یؤذی الحی ولا یبلغ المیت۔"

عکرمہ ابن ابی جہل بہت جلد ایک مومن و مہاجر کی حیثیت سے تمہارے پاس پہنچنے والا ہے اس کے باپ کو ملامت کرنا، مردے کو برا کہنے سے زندہ کو اذیت پہنچتی ہے اور میت کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد عکرمہ اپنی بیوی ام حکیمؓ کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچ گیا۔ آپؐ اسے دیکھتے ہی فرط مسرت سے اچھل پڑے اور چادر کے بغیر ہی اس کے استقبال کے لئے لپکے۔ پھر جب آپؐ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے تو عکرمہ نے کھڑے کھڑے عرض کیا:

"محمدؐ! ام حکیم نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے۔"

حضورؐ نے جواب دیا "اس نے صحیح کہا ہے۔ تم مامون ہو۔"

اس نے دوبارہ سوال کیا "اے محمد! آپ مجھے کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟"

"میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا لائق عبادت و پرستش نہیں ہے اور اس بات کی کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں اور اس بات کی کہ تم زکوٰۃ دو" آپ نے ارکان اسلام گنانے ہوئے فرمایا۔

"بخدا! آپ نے حق کی دعوت دی اور خیر کا حکم دیا...... بخدا آپ اس دعوت سے پہلے بھی ہم میں سب سے سچے اور نیکو کار تھے۔" یہ کہہ کر اس نے بیعت کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

اسلام لانے کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی: "اللہ کے رسولؐ! مجھے سب سے اچھی چیز بتا دیجئے تاکہ میں اسے برابر پڑھا کروں۔"

"اشهد ان لآ اله الا الله واشهد ان محمدًا عبده ورسولهٗ پڑھا کرو"

آپ نے جواب دیا۔

پوچھے: "اس کے بعد کیا؟"

فرمایا: "یہ کہو کہ میں خدائے تعالیٰ اور حاضرین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں مسلم ہوں، مجاہد ہوں اور مہاجر ہوں"۔ اور عکرمہؓ نے اس کو کہہ دیا۔

جس وقت آپ نے ان سے فرمایا کہ "آج تم جو چیز بھی مجھ سے مانگو گے وہ میں تمہیں عطا کروں گا"۔

"میں چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ جتنی عداوت کی، جہاں کہیں بھی آپ کے مدمقابل ہوا اور آپ کے خلاف جو بات بھی، خواہ آپ کے روبرو یا آپ پشت کہی ہو ان سب سے میرے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں"۔ عکرمہؓ نے زبانِ سوال کھولی۔

تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا کی:

"اللّٰهم اغفر له كل عداوة عادانيها وكل مسير سار فيه الى موضع يريد به اطفاء نورك واغفر له ما نال مني من عرض في وجهي او انا غائب عنه"

خدایا! ہر اس عداوت سے عکرمہ کی مغفرت فرما جو اس نے میرے ساتھ کی، اور معاف فرما دے اسکی ہر اس ہرزگی کو جس کے ذریعہ اس نے تیرے نور کو بجھانے کی کوشش کی، اور درگزر فرما اسکی ہر اس حرکت کو جو اس نے میری آبرو سے کھیلتے ہوئے میرے سامنے یا میری عدم موجودگی میں کی ہو۔

اس دعا کو سن کر حضرت عکرمہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور انھوں نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم آج سے پہلے اللہ کی راہ سے بندگانِ خدا کو باز رکھنے کے لئے جتنا مال میں خرچ کرتا رہا ہوں، اب آج کے بعد سے خدا کی راہ میں، اس کا دوچند خرچ کروں گا۔ اور آج سے پہلے خدا کے دین سے روکنے کے لئے جتنی قوت سے لڑتا رہا، آج کے بعد سے اس سے دوگنی طاقت کے ساتھ راہِ خدا میں لڑوں گا"۔

اور اس روز سے مسلمانوں کی جماعت میں ایک ایسے شخص کا اضافہ ہوا جو میدان کا رزار میں

ایک شہسوار شہسوار اور مسجدوں میں ایک عابد شب زندہ دار اور قاری قرآن تھا۔ وہ قرآن کریم کو اپنے چہرے پر رکھ کر خدا کے خوف سے روتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں کہتے کتابُ ربّی .... کلامُ ربّی ....

حضرت عکرمہؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ ان کے قبولِ اسلام کے بعد کفر و اسلام کے مابین جو بھی معرکہ پیش آیا، اس میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوئے اور مسلمان جب بھی کسی مہم پر نکلے اس میں آگے آگے رہے۔ معرکۂ یرموک میں تو حضرت عکرمہؓ میدانِ قتال کی طرف اس طرح لپکے تھے جیسے کوئی تشنہ لب شدید گرمی میں ٹھنڈے میٹھے پانی کی طرف لپکتا ہے۔ ایک موقع پر جب مسلمانوں پر دشمن کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑے تلوار کی نیام توڑ کر پھینک دی اور ننگی تلوار لے کر رومیوں کی صفوں میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت خالد بن ولیدؓ نے فوراً ان کے پاس پہنچ کر کہا:

"عکرمہ! ایسا نہ کیجئے۔ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالئے۔ آپ کا قتل ہو جانا مسلمانوں کے لئے ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تلافی سانحہ ہوگا"۔

لیکن حضرت عکرمہؓ نے ان سے کہا: خالد! ہٹ جاؤ۔ میرا راستہ نہ روکو۔ صحبتِ رسولؐ سے استفادہ اور خدمتِ اسلام میں تم کو میرے اوپر سبقت حاصل ہے۔ میں اور میرا باپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کٹر مخالف تھے اور میں آخری دم تک اس مخالفت پر قائم رہا اس لئے صحبتِ رسولؐ کا شرف میرے حصے میں بڑی تاخیر سے آیا۔ مجھے چھوڑ دو۔ آج میں گزشتہ کوتاہیوں اور محرومیوں کی تلافی کر لینا چاہتا ہوں..... پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا:

"میں بہت سے مواقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جم کر لڑا۔ کیا آج اللہ رومیوں کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار کر لوں؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا"۔ پھر انھوں نے مسلمانوں کو پکارا "موت پر کون بیعت کرتا ہے؟"

ان کی پکار پر تقریباً چار سو مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان بیعت

کرنے والوں میں ان کے چچا حضرت حارث بن ہشام اور حضرت ضرار بن ازور بھی شامل تھے ان لوگوں نے حضرت خالد بن ولید (قائد لشکر) کے خیمے کے گرد پیش سخت خونریز جنگ کی اور دشمن کے بڑھتے ہوئے حملوں کا بہترین انداز میں دفاع کیا۔ جب فضائے یرموک پر سے جنگ وقتال کے بادل چھٹے اور مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کا آفتاب طلوع ہوا تو یرموک کی زمین پر تین مجاہد زخموں سے چور چور پڑے ہوئے تھے اور وہ تھے حضرت حارث بن ہشام، حضرت عیاش بن ربیعہ، اور حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

شدت تشنگی سے بے تاب حضرت حارثؓ نے پانی مانگا۔ جب پانی ان کو پیش کیا جا رہا تھا، حضرت عکرمہؓ نے ان کی طرف دیکھا۔ حضرت حارثؓ نے پہلے ان کو پانی پلانے کا اشارہ کیا اور جب پانی ان کے پاس لے جایا گیا تو حضرت عیاشؓ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ حضرت عکرمہؓ نے اشارہ کیا کہ پہلے ان کی پیاس بجھائی جائے اور جب پانی پلانے والے ان کے قریب گئے تو دیکھا کہ وہ اس سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ جب وہ پلٹ کر پہلے دونوں صحابیوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ لوگ بھی آب کوثر سے اپنی پیاس بجھا چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں سے راضی ہو اور انھیں حوض کوثر سے اس طرح سیراب کرے کہ اس کے بعد انھیں تشنگی نہ محسوس ہو اور انھیں جنت الفردوس کی سرسبزی و شادابی مرحمت فرمائے جس سے وہ ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں۔ آمین ••

سیرت نبویؐ کے مصادر

تحریر: خالد محمد الصاعدی — ترجمانی: انیس احمد فلاحی

قرآن کریم

سیرت نبوی کے مصادر میں سب سے اہم اور مقدم قرآن کریم ہے کیونکہ قرآن کریم نے عہد نبوت کے بعض تاریخی غزوات پر تبصرہ کیا ہے مثلاً غزوۂ بدر، احد، خندق اور حنین۔ نیز ہم قرآن میں حجاز کے یہود اور مسلمانوں کے مابین فکری اور مادی کشمکش کی حسین وجمیل منظرکشی پاتے ہیں۔ لہٰذا سیرت کی روایات کو قبول کرتے وقت یہ بات پیش نظر رکھنا لازمی ہے کہ کہیں وہ روایت آیات قرآنیہ سے متعارض تو نہیں ہے۔ البتہ قرآن سے تاریخی جزئیات کی تفصیل کی توقع کار عبث ہے کیونکہ قرآن کریم فن تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ دستور حیات ہے۔

کتب حدیث

سیرت کا دوسرا اہم مصدر کتب حدیث ہیں کیونکہ احادیث عقائد، اسلامی آداب و احکام کی توضیح کرتی ہیں بلکہ بعض کتب حدیث تو مغازی کے ایک مستقل باب کو سموئے ہوئے ہیں جیسے صحیح بخاری۔

کتب حدیث کی مغازی وسیرت سے متعلق روایات مغازی اور تاریخ کی کتابوں کی روایات سے زیادہ معتبر ہیں کیونکہ کتب حدیث محدثین کی انتھک محنت وجہد کا ثمرہ ہیں۔ کتب حدیث نے چونکہ سیرت پر انتہائی اختصار کے ساتھ بحث کی ہے اس لئے صرف ان پر انحصار کرنے سے بسا اوقات ہم الجھنوں اور پیچیدگیوں میں گرفتار ہو جائیں گے مثلاً صحیح بخاری کی روایت ہے کہ:

"نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بنو مصطلق پر حملہ کیا اور وہ لوگ غفلت میں تھے"

تاریخ وسیر کی کتابوں سے ناواقف شخص جب اس روایت کو پڑھے گا تو وہ یہی سمجھیگا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بغیر انذار کے ان پر حملہ کر دیا اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ

تعامل اسلام کے اس اصول سے ٹکراتا ہے کہ "کسی قوم پر اتمام حجت کیے بغیر حملہ نہیں کیا جاسکتا" اور جب ہم سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بنو مصطلق تک دعوت دین پہنچ چکی تھی نیز یہ غزوۂ احد میں کفار مکہ کے ساتھ جنگ میں شریک تھے۔ گویا وہ محارب تھے۔

احادیث کی مستند کتابیں جو ہم تک پہنچی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱: صحیح بخاری۔ ۲: صحیح مسلم۔ ۳: ترمذی شریف۔ ۴: سنن ابی داؤد۔ ۵: سنن نسائی۔ ۶: سنن ابن ماجہ۔ ۷: موطا مالک۔ ۸: مسند احمد بن حنبل۔ ۹: مسند دارمی۔

کتب الدلائل

دلائل نبوت اور معجزات نبوی کی اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

اعلام النبوۃ (داؤد بن علی الاصبہانی)

اعلام النبوۃ (ابن ابی حاتم)، اعلام النبوۃ (ابن ابی الدنیا)

دلائل النبوۃ (ابو نعیم احمد بن عبد اللہ الاصبہانی)

تثبیت دلائل النبوۃ (قاضی عبدالجبار)، دلائل النبوۃ (بیہقی)

دلائل النبوۃ (ماوردی)، الخصائص الکبریٰ (سیوطی)

کتب شمائل

شمائل نبوی پر اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

صفۃ اخلاق النبی (داؤد بن علی الاصبہانی)، الشمائل النبویۃ والخصائص المصطفویۃ (ترمذی)، الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ (قاضی عیاض) مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفا (سیوطی)، اخلاق النبی وآدابہ (عبداللہ بن محمد بن حیان اصبہانی)

کتب سیرت

سیرت کی قدیم کتابوں کی قدر و قیمت اس لئے زیادہ ہے کہ وہ تابعین کے دور میں لکھی گئی ہیں۔ جس وقت صحابہ کرام اس دست ولادت میں نیابت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور صحابہ نے ان کتابوں پر اظہار نکیر نہیں کیے اور ان کا اظہار نکیر نہ کرنا ان کتابوں کی تصدیق و توثیق ہے اور عصر نبوت سے قریبی عہد میں لکھے جانے کی وجہ سے ان میں تحریف، مبالغہ، تبدیلی اور ضیاع کا اندیشہ بھی بہت کم ہے۔

دستیاب شدہ سیرت کے قدیم مصادر میں اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔ **تہذیب سیرۃ ابن ہشام**: یہ کتاب ابن اسحاق کی کتاب کی تلخیص ہے۔ چنانچہ ابن ہشام نے اس کی بہت ساری اسرائیلی روایات اور اشعار کو حذف کر دیا ہے اور بہت سی مستند معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ حافظ سہیلی نے سیرۃ ابن ہشام کی شرح کی ہے جس کا نام الروض الانف ہے اور وہ مطبوعہ ہے۔

۲۔ **الطبقات الکبریٰ (محمد بن سعد)**: اس کی پہلی دو جلدیں سیرت نبوی پر ہیں۔ یہ کتاب عرصے سے مفقود تھی۔ مسلمانوں کے پاس اس کا مکمل نسخہ کہیں موجود نہ تھا۔ اب یورپ کے عیسائیوں نے اسے چھپوایا ہے۔ چونکہ یہ پوری کتاب ہمیں یورپ کے واسطے سے ملی ہے اس لئے اس کی سند متداول کتابوں سے مل جانے کے بعد ہی ہم اس پر اعتماد کر سکتے ہیں۔

۳۔ **تاریخ خلیفہ بن خیاط**: یہ ثقہ محدث ہیں اور امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں۔

۴۔ **انساب الاشراف (بلاذری)**

۵۔ تاریخ الرسل والملوک (محمد بن جریر الطبری): اس کتاب کا ایک جز سیرت کے لئے خاص ہے۔ امام طبری بلا امتیاز صحت و ضعف تمام روایتوں کو نقل کر دیتے ہیں۔

۶۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر (ابن عبد البر القرطبی)، ۷۔ جوامع السیرۃ (ابن حزم)

۸۔ الکامل فی التاریخ (ابن اثیر): یہ تاریخ کی کتاب ہے جس کا ایک جز سیرت کے لئے خاص ہے۔

۹۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر (ابن سید الناس): یہ ایک ثقہ محدث ہیں اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔

۱۰۔ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد (ابن قیم الجوزیہ۔ ۷۰۱ھ)

۱۱۔ السیرۃ النبویۃ (الحافظ الذہبی)

۱۲۔ البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر): یہ عام تاریخ پر ایک کتاب ہے جس کا جز سیرت کے لئے ایک جز خاص ہے۔

۱۳۔ سیرۃ ابن کثیر۔ ۱۴۔ امتاع الاسماع (مقریزی)۔

۱۵۔ المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ (قسطلانی ۹۲۳ھ)، ۱۶۔ شرح المواہب اللدنیۃ (محمد بن عبد الباقی الزرقانی ۱۱۲۲ھ)

۱۷۔ السیرۃ الحلبیۃ (برہان الدین حلبی) یہ کتاب اسرائیلی قصوں اور ضعیف روایتوں کا پلندہ ہے جس کی اسانید غائب ہیں۔ البتہ انھوں نے بعض غریب الفاظ اور روایات کی تحقیق کی ہے، اور بہت سارے نوٹ چھوڑے ہیں۔

۱۸۔ سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد (محمد بن یوسف الدمشقی)

مذکورہ بالا کتابیں سیرت کے دستیاب شدہ مصادر کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن تمام کتابیں صرف صحیح روایتوں پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ رطب و یابس دونوں کا مجموعہ ہیں۔ مطالعہ کے دوران پہلے تو ہمیں صحیح روایتوں کو قبول کرنا چاہیے پھر حسن پھر حسن سے قریب تر۔ بعض لوگوں کا یہ مسلک ہے کہ ضعیف حدیثوں سے عقیدہ یا تشریعی امور کا استنباط تو ناجائز ہے لیکن اگر ضعیف حدیث اخلاق عمدہ پر ابھارتی ہو یا صنعت و زراعت کے سلسلے میں وارد ہو تو اس کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن صحیح مسلک یہی ہے کہ ضعیف حدیثوں سے استنباط کرنا مطلق ناجائز ہے۔

سیرت کے جدید مراجع میں مندرجہ ذیل کتابیں اہمیت کی حامل ہیں:

۱۔ السیرۃ النبویۃ (الندوی)، ۲۔ فقہ السیرۃ (غزالی)، ۳۔ السیرۃ النبویۃ دروس و عبر (محمد عزہ دروزہ)، ۵۔ تہذیب سیرۃ ابن ہشام (عبد السلام ہارون)، ۶۔ الرحیق المختوم (صفی الرحمن مبارکپوری)، ۷۔ الرسول القائد (محمود شیت خطاب)، ۸۔ تاریخ العرب فی الاسلام۔ السیرۃ النبویۃ (جواد علی)

الفصول فی سیرۃ الرسول (ابن کثیر تحقیق محمد الخضراوی)

اردو میں سیرۃ کی مستند اور اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

سیرت النبی (علامہ شبلی نعمانی)۔ محسن انسانیت (نعیم صدیقی)

اصح السیر (عبد الرؤف)، رحمۃ للعالمین (قاضی محمد سلیمان منصور پوری)

یہ قدیم و جدید مصادر سیرت پر ایک اچٹتی نظر ہے۔ سیرت کے مطالعہ کرنے والے تمام ہی لوگوں کے لئے یہ مشورہ ہے کہ وہ تاریخی و تفسیری واقعات و روایات کی جرح و تعدیل سچائی اور خلوص کے ساتھ کریں تاکہ آفتاب و ماہتاب سے بھی زیادہ روشن اور تابناک حیات رسول بیہودگی اور آمیزش سے پاک ہوکر "انک لعلی خلق عظیم" کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔

امام سیوطیؒ اور "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور"

عبد البر اثری فلاحی

تعارف

نام جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمن بن ابو بکر، وطن اسیوط یا سیوط، شافعی المسلک تھے۔ ۱؍ رجب ۸۴۹ھ مطابق ۱۴۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ یتیمی کی حالت میں قاہرہ کے اندر پرورش پائی کیونکہ جب وہ پانچ سال سات مہینے کے تھے تبھی ان کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ انھوں نے آٹھ سال سے کم ہی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ پھر وہ مختلف علوم و فنون کے حصول میں لگ گئے۔ ان کے شاگرد داؤدی نے ان کے اساتذہ کی تعداد ۵۱ بتائی ہے جبکہ انھوں نے اپنی ذاتی سوانح میں پچاس اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ حصول علم کی خاطر شام، حجاز، یمن، ہند، مغرب، تکرور وغیرہ کا سفر کیا۔ افتاء و تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے لیکن جب چالیس سال کے ہوئے تو دنیا سے منہ موڑ لیا اور عبادت و تقرب الٰہی کی طرف یکسو ہو گئے۔ افتاء و تدریس کا کام بھی چھوڑ دیا۔ اپنی "التنفیس" نامی کتاب میں لوگوں سے اس سلسلے میں معذرت کر لی اور "روضۃ المقیاس" میں قیام پذیر ہوئے اور وفات تک وہیں رہے۔ ایک ہفتہ کی علالت کے بعد ۱۹؍ جمادی الاولیٰ ۹۱۱ھ مطابق ۱۵۰۵ء کو جمعہ کی صبح کو اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ روضۃ المقیاس میں جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد شیخ احمد ابریقی میں شعرانی نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر قدیم مصر میں جامع جدید کے اندر ایک جم غفیر نے دوبارہ آپ کی نماز جنازہ پڑھی اور دوسری جگہوں پر بھی لوگوں نے آپ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ قاہرہ کے اندر باب القرافہ کے باہر حوش قوصون میں مدفون ہوئے جسے اس وقت "بوابۃ السیدۃ عائشہؓ" کہا جاتا ہے۔

علم وفضل

امام سیوطیؒ کو بہت سارے علوم میں تبحر عطا ہوا تھا مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، معانی، بیان، بدیع، اصول فقہ، جدل، تصریف، انشاء، ترسل، فرائض، قراءت وغیرہ۔ حتیٰ کہ بعض میں اپنے اساتذہ سے بھی آگے بڑھ گئے اور حجت قرار پائے۔ علم حدیث اور اس کے متعلق فنون متون واسانید، رواۃ، رجال اور استنباط احکام میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ "مجھے دو لاکھ احادیث یاد ہیں اور اگر میں مزید احادیث پاتا تو انھیں بھی ضرور یاد کر لیتا"۔

تالیف وتصنیف

انھیں تصنیف و تالیف سے خصوصی دلچسپی تھی اس لئے ۱۷ سال کی عمر ہی میں تالیف شروع کر دی اور سب سے پہلے "شرح الاستعاذۃ والبسملۃ" تحریر فرمائی۔ آپ سرعت تالیف میں بے مثال تھے۔ ان کے شاگرد داؤدی اپنا عینی مشاہدہ بتلاتے ہیں کہ استاذ گرامی ایک دن میں ۳ کاپیاں لکھ لیا کرتے تھے۔ اسی لئے آپ کثیر التصانیف ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ہزار تک بھی بتائی جاتی ہے ویسے عام طور سے ۵۰۰ اور ۶۰۰ کی تعداد بتائی جاتی ہے۔ معجم طبقات الحفاظ ص ۱۴۲ میں ۵۳۸ مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتب کا نام بنام تذکرہ ہے۔ جن میں ۷۳ تفسیر، ۲۰۵ حدیث، ۳۲ مصطلاح حدیث، ۷۱ فقہ، ۲۰ تصوف، اصول فقہ ودینی، ۲۰ لغت، نحو اور صرف اور ۶۶ معانی بیان اور بدیع وغیرہ پر ہیں۔ اور یہ تمام کی تمام کتب گراں قدر اور اپنے موضوع پر بے نظیر ہیں۔ چنانچہ صاحب فہرس الفہارس الکتانی نے ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی کا قول بھی اس سلسلے میں نقل کیا ہے جو انھوں نے مؤطا کے حواشی میں تحریر فرمایا ہے۔

"اور ان کی تمام تصانیف باریک اور عمدہ فوائد پر مشتمل ہے جو ان کے تبحر علمی، وسعت نظر اور غوص فکر کی شہادت دیتی ہیں اور وہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ انھیں نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے آغاز کا مجدد امت شمار کیا جائے"۔ چنانچہ انھوں نے خود بھی اپنی اس حیثیت کے سلسلے میں متعدد جگہوں پر دعویٰ کیا ہے اور ان کے بعد علی القاری الحنفی نے بھی "المرقاۃ" میں ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور پھر فرماتے ہیں:

"امام سیوطی ہی وہ فرد ہیں جنھوں نے علم تفسیر کو "در منثور" میں زندہ کیا ہے اور

تمام متفرق احادیث کو اپنی مشہور جامع میں جمع کر دیا ہے اور تقریباً تمام ہی فنون پر ان کی اصل تصنیف یا شرح ہے بلکہ انھوں نے ان فنون میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے اس لئے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ وہ دسویں صدی کے مجدد قرار پائیں"۔ (المرقاۃ ۱/۳۶) (فہرس الفہارس ۱/۳۵۸ - ۳۵۹)

چونکہ اس وقت میرے پیش نظر ان کی خاص اور اہم تفسیر "الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور" ہے اس سلسلہ میں بجائے ان کی تمام کتب کی فہرست بتلانے کے صرف فن تفسیر سے متعلق ان کی اہم کتابوں کے ناموں کا تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اس فن پر آپ ان کی کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔ بقیہ کتب کے نام وغیرہ کی تفصیلات کیلئے اصل کی طرف مراجعت فرمائیں۔

۱- الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور۔ ۱۲ ضخیم جلدیں۔
۲- التفسیر المسند بنام ترجمان القرآن۔ ۵ جلد
۳- الاتقان فی علوم القرآن۔ ۴- الاکلیل فی استنباط التنزیل
۵- لباب النقول فی اسباب النزول۔ ۶- الناسخ والمنسوخ فی القرآن
۷- مفحمات الاقران فی مبہمات القرآن۔ ۸- اسرار التنزیل بنام "قطف الازہار فی کشف الاسرار" یہ صرف سورہ توبہ تک لکھی جاسکی ہے۔ ۹- شیخ جلال الدین محلی کی تفسیر کا تکملہ آغاز قرآن سے سورہ اسراء تک۔ ۱۰- تناسق الدرر فی تناسب الآیات والسور
۱۱- تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بنام نواہد الابکار وشوارد الافکار۔ ۴ جلدوں میں۔
۱۲- التحبیر فی علوم التفسیر۔ ۱۳- المہذب فیما وقع فی القرآن من المعرب
۱۴- خمائل الزہر فی فضائل السور۔ ۱۵- مراصد المطالع فی تناسب المطالع والمقاطع
۱۶- میزان المعدلۃ فی شأن البسملۃ۔ ۱۷- شرح الاستعاذۃ والبسملۃ
۱۸- الازہار الفائحۃ علی الفاتحۃ۔ ۱۹- منتقی من تفسیر الفریابی۔
۲۰- ایضاً، عبدالرزاق
۲۱- ایضاً، ابن ابی حاتم
۲۲- الدر النثیر فی قراءۃ ابن کثیر

مقصدِ تالیف

اس تفسیر کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے الاتقان ج ۲ ص ۱۸۳ پر وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"میں نے ایک مستند کتاب تیار کی ہے جس میں نبی کریم سے قرآن سے متعلق تفسیری اقوال جمع کر دیئے ہیں جن کی تعداد کئی ہزار ہے۔ اس میں مرفوع و موقوف دونوں طرح کی روایات ہیں۔ یہ چار جلدوں میں مکمل ہوئی ہے اور میں نے اسکا نام "ترجمان القرآن" رکھا ہے۔"

مزید "درمنثور" کے مقدمے میں رقمطراز ہیں کہ "جب میں تفسیر ترجمان القرآن کی تالیف سے فارغ ہوا جس میں کہ میں نے احادیث کی اسانید بتمام و کمال درج کر دی تھیں اور اس کے مختلف طرق کا بھی تفصیلاً تذکرہ کیا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس وقت لوگوں کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں اور لوگ اسانید سے قطع نظر صرف متون احادیث کے مطالعہ پر اکتفا کرتے اور طوالت سے گھبراتے ہیں۔ لہٰذا میں نے اس کا اختصار تیار کیا جس میں میں نے صرف متن حدیث پر اکتفا کیا اور ماخذ یعنی جس کتاب سے وہ روایت لی ہے، اس کا ذکر کر دیا پھر میں نے اس کا نام "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" رکھا۔"

گویا یہ ان کی تفسیر ترجمان القرآن کا اختصار ہے جس میں عام بیزاری کے اندیشے سے اسانید حذف کر دی گئی ہیں، اور ہر روایت کو اس کتاب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے جس سے وہ لی گئی ہے۔

خصوصیات

اس تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جامع ہے یعنی نبی کریم، صحابہ کرامؓ اور علمائے سلف کے تقریباً تمام تفسیری اقوال بلا کسی نقد و تبصرہ، جرح و تعدیل اور صحیح و ضعیف کی تمیز کے اکٹھا کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابوداؤد، مسند احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، عبد بن حمید اور ابن ابی الدنیا وغیرہ سے اخذ کر کے تفسیری روایات کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔

اس کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ تفاسیر ماثورہ میں سے تنہا یہ ایک ایسی تفسیر ہے جس میں صرف تفسیری اقوال و آثار کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے اور اپنی رائے کو

جگہ نہیں دی گئی جیسا کہ دیگر تمام کتب تفاسیر ماثورہ میں ذاتی افکار و آراء بھی شامل ہیں۔

اس کی ایک تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر امام سیوطیؒ نے ایک آیت کے متعلق صحابہ کرامؓ اور مشہور قراء سے منسوب متعدد قراءتوں کو مختلف روایات سے نقل کیا ہے۔

اس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر متفرق لغوی مباحث ہیں جو ایسے الفاظ پر مشتمل ہیں جن کو قرآن نے استعمال کیا ہے لیکن وہ عربوں میں معروف نہیں ہیں۔ بس انھوں نے ان کے عربی ہونے کو شعراء کے کلام سے ثابت کیا ہے اور لوگوں کے اس شک کی تردید کی ہے کہ عرب ان الفاظ سے واقف نہیں تھے۔

ایک تنبیہ، ایک ضرورت

لیکن چونکہ امام سیوطیؒ جمع و تالیف اور کثرت روایت کے دلدادہ ہیں اس لئے اپنی جلالت قدر، فن حدیث اور اسماء کے علم سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود انھوں نے اس تفسیر میں صحت کا خیال نہیں کیا ہے اور نتیجۃً یہ کتاب صحیح و سقیم اور رطب و یابس کا آمیزہ بن گئی ہے۔ اس لئے سند کی تحقیق کئے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ ہی اس سے دلیل و حجت قائم کی جا سکتی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ کاٹ چھانٹ کر کے اس کے صحیح مواد کو الگ کیا جائے تاکہ بلا کسی شک و ریب اور الجھن و پریشانی کے تفاسیر ماثورہ صحیحہ سے استفادہ آسان ہو سکے۔

دستیاب نسخے

یہ تفسیر بھی متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ عام طور سے دستیاب اور متداول ہے۔ اس کا پانچ جلدوں پر مشتمل ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۹۵۵ھ کتب خانہ احمدیہ (حلب) میں موجود ہے۔ چونکہ سابقہ اشاعتیں خراب تھیں، ان کے حروف چھوٹے تھے اور عام طور سے اصول کتابت کا خیال نہیں کیا گیا تھا اس وجہ سے ان سے استفادہ مشکل تھا لہٰذا اب دار الفکر نے اسے بنا سنوار کر فہرست آیات، اور چند ضروری حواشی کے اضافہ کے ساتھ آٹھ جلدوں میں شائع کیا ہے اور اب عام طور سے یہ دستیاب ہے لہٰذا ان سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔

پہلی قسط

زبان وادب کی ترقی میں قرآن کا رول

توقیر عالم فلاحی ۔ ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دنیا میں کوئی ادب بھی رائج ہو، بلا انکار و تردید کسی خاص خطۂ ارض کے لوگ اس کے نشیب و فراز، خم و پیچ اور اسرار و نوامیس سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ زبان و بیان کی تمام نزاکتوں کو سمجھنے والے لوگ اس میدان میں مستند حیثیت کے مالک ہوتے ہیں اور یہی لوگ ادب کے لحاظ سے مرجع خلائق بھی ہوتے ہیں۔ عربی زبان دنیا کی ان عالمگیر زبانوں میں ایک ہے جو وسیع ترین رقبۂ ارض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی آفاقیت کا اندازہ اس زبان کی وسعت و ہمہ گیری، بے مثل شیرینی و لاتعداد دائرہ آفرینی میں مضمر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی صبح درخشاں کے نکلنے سے کر موجودہ دور تک عربی زبان پر متعدد انقلابات آئے۔ صدیاں گزر گئیں، اقوام و ملل سنت کے مطابق عروج و اقبال اور زوال و ادبار سے ہمکنار ہوئے لیکن عربی زبان رو بہ اقبال رہی۔ عہد اسلامی ابتدائی ہو یا عہد بنو امیہ، عہد عباسیہ کی سلطنت ہو یا ترکی و مصری انقلاب کا زمانہ یا پھر دور حاضر ہر دور میں ایسے ادباء ـــــ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی اپنی مخصوص جہتوں کے لحاظ سے زبان و ادب کے فروغ و اشاعت کی جد و جہد کی ہے۔

جاہلی ادب ۔ ایک مطالعہ

عربی زبان و ادب میں زمانۂ جاہلیت کو ایک اعلیٰ اور افضل مقام حاصل ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اگرچہ مدون شکل میں باضابطہ فن و ادب کا سراغ نہیں ملتا ہے تاہم زندگی کے جملہ معاملات میں عربی زبان ہی ان کی معین و مددگار تھی وہ زبان کی نزاکتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اظہار و بیان میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ فصاحت و بلاغت ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ یہاں تک کہ فنی حذق و مہارت میں اپنے آگے دوسرے تمام لوگوں کو ہیچ اور عاجز سمجھتے تھے۔ بلکہ گونگا کہہ دینا بھی اپنا قانونی حق سمجھتے تھے۔ چونکہ عہد جاہلی میں نثر محض، مثال، خطبوں اور وصیتوں تک ہی محدود تھا۔[1]

ہاں شعر و شاعری وہ وسیع و عریض میدان تھا جس کی جولانگاہ میں وہ بے محسل و خشی پھرتے تھے اور اپنی جودتِ طبع کا عملی مظاہرہ کرتے تھے اسلئے یہاں عربوں کے اس سرمایۂ ادب ہی کا ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کا تعلق شعر و شاعری سے ہے۔ ادب کی یہ صنف اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ عرب شعراء کو اپنے قبیلے کی زبان کہتے تھے ایک شاعر ہی کسی فرد، قبیلہ یا خاندان کو عزت و توقیر سے ہمکنار کرتے اور کسی کو ذلت و نکبت کے قعر میں گرا دینے پر قادر تھا۔ بہر حال شعراء قبیلے کی جان ہوا کرتے تھے جنکی پیدائش پر خاص تقریب کا اہتمام کیا جاتا اور متعلقہ قبائل کو مبارکبادیاں پیش کی جاتیں۔ شعراء عرب میں بھی ہم ان شعراء کے چیدہ کلام کو لیتے ہیں جو اصحاب معلقات کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں معروف و مقبول ہیں اور جو زبان و ادب اور تعبیر و بیان کے لحاظ سے سریا پر اپنی فتح و تسخیر کی کمندیں ڈالے ہوئے ہیں۔ رئیس الشعراء امرؤ القیس جو شاعر تخیل سے بھی موسوم ہے رات کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وليل كموج البحر ارخى سدوله ــــ على بانواع الهموم ليبتلى
فقلت له لما تمطى بصلبه ــــ واردف اعجازا وناء بكلكل
الا ايها الليل الطويل الا انجلى ــــ بصبح وما الاصباح منك بامثل
فيالك من ليل كان نجومه ــــ بكل مغار الفتل شدت بيذبل

ترجمہ:۔ (۱) اور اس رات نے جو سمندر کی موج کی طرح ہیبت ناک تھی، جب مجھے آزمانے کے لئے مختلف قسم کی پریشانیوں اور مصیبتوں کی جھولیں میرے اوپر ڈال دیں۔

(۲) اور جب اس نے اپنی پیٹھ کو لمبا کیا اور اپنے پچھلے حصہ کو قریب لائی رہی اور اپنے سینے کو دراز کیا تو میں نے کہا کہ (۳) اے لمبی رات! کیا تو صبح کے جلوے میں درخشاں نہیں ہو سکتی مگر وہ صبح بھی تو تجھے زیادہ خوش آئند نہیں ہے (۴) تو بھی کیا خوب رات ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ تیرے ستارے یذبل پہاڑ (جو نجد میں ہے) سے مضبوطی ہوئی

رسیوں سے کس کر باندھ دیئے گئے ہوں۔

اعشیٰ جو مدح گوئی کی صف میں جاہلی شعراء میں اپنا مدِ مقابل نہیں رکھتا وہ محلق کی مدح سخاوت بیان کرنے میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتا ہے نتیجتاً اس کی سات بچیوں کی شادی کا مسئلہ معجزانہ طریقے سے حل ہو جاتا ہے۔ وہ محلق کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے:

لعمری لقد لاحت عیون کثیرة	الی ضوء نار بالیفاع تحرق
تشب لمقرورین یصطلیانها	وبات علی النار الندی والمحلق
رضیعی لبان ثدی ام تقاسما	باسحم داج عوض لا نتفرق
تری الجود یجری ظاهرا فوق وجهه	کما زان متن الهندوانی رونق
یداه یدا صدق فکف مبیده	وکف اذا ما ضن بالمال تنفق

ترجمہ: (۱) میری جان کی قسم بہت سی آنکھیں اس آگ کی روشنی کی طرف اٹھ گئیں جو ایک ٹیلے میں جل رہی تھی۔

(۲) یہ آگ دو سردی کھائے ہوئے آدمیوں کے لئے جلائی جا رہی تھی جو اسے تاپ رہے تھے اور وہ سخاوت اور محلق تھے جنھوں نے اپنی ساری رات اس آگ کے پاس گزار دی۔

(۳) دونوں نے ایک ہی ماں کی چھاتیوں کا دودھ پیا ہے اور انھوں نے ایک گھنگھور تاریک رات میں قسم کھائی تھی کہ کبھی بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوں گے۔

(۴) تم اس کے چہرے کی طرف دیکھو تو تمہیں اس پر سخاوت کی آن بان جھلکتی نظر آئے گی۔ جس طرح ہندوستان کی بنی تلوار کی دھار کو آب و تاب نکھار دیتی ہے۔

(۵) اس کے دونوں ہاتھ درحقیقت جود و سخا کے ہاتھ ہیں، تو ایک ہتھیلی مال کو ٹھکانے لگاتی ہے اور دوسری جب لوگ مال خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں تو خرچ کرتی ہے۔

عمرو بن کلثوم قبیلہ تغلب کی ناک ہے جب اس نے اپنا مشہور معلقہ کہا تو قبیلہ بکر نے اپنا سر نیچا کر لیا۔ یہاں اس کے مشہور معلقہ کے وہ اشعار ملاحظہ کئے جائیں جنھیں تغلب کا بچہ بچہ تسبیح کے طور پہ پڑھتا تھا۔ شاعر کہتا ہے:

وقد علم القبائل من معد	اذا قبب بابطحها بنینا
بانا المطعمون اذا قدرنا	وانا المهلکون اذا ابتلینا
وانا المانعون لما اردنا	وانا النازلون بحیث شئنا
وانا التارکون اذا سخطنا	وانا الآخذون اذا رضینا
وانا العاصمون اذا اطعنا	وانا العازمون اذا عصینا
ونشرب ان وردنا الماء صفوا	ویشرب غیرنا کدرا وطینا
اذا ما الملک سام الناس خسفا	ابینا ان نقر الذل فینا
ملأنا البر حتی ضاق عنا	وماء البحر نملؤه سفینا
اذا بلغ الفطام لنا صبی	تخر له الجبابر ساجدینا

ترجمہ: معد کے قبیلوں نے اس وقت یہ بات جانی جب ہم نے اپنے مکانات ان کی زمینوں میں تعمیر کرلئے

(۲) کہ جب ہم قدرت رکھتے ہیں تو کھلانے والے ہوتے ہیں اور جب ابتلا و آزمائش سے دوچار ہوتے ہیں تو ہلاکت میں پہنچا دینے والے ہوتے ہیں (۳) ہم جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں روک دیتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں فروکش ہو جاتے ہیں (۴) جب ہم ناراض ہوتے ہیں تو چھوڑ دیتے ہیں اور جب خوش ہوتے ہیں تو لے لیتے ہیں (۵) جب ہماری باتیں مانی جاتی ہیں تو ہم نافرمان ہو جاتے ہیں اور جب ہماری نافرمانی کی جاتی ہے تو حملہ آور ہو جاتے ہیں (۶) ہم اگر گھاٹ پر پانی پینے جاتے ہیں تو صاف و شفاف پانی پیتے ہیں اور ہمارے علاوہ دوسرے لوگ گدلا پانی پیتے ہیں (۷) جب بادشاہ ذلت کے ساتھ لوگوں پر غالب آجاتا ہے تو ہم اس بات سے انکار کر دیتے ہیں کہ ہم اپنے اندر ذلت کو گوارہ کرلیں (۸) ہم نے خشکی کو بھر دیا یہاں تک کہ زمین ہمارے لئے تنگ ہو گئی اور سمندر کے پانی کو ہم کشتی سے بھر دیتے ہیں ۔ جب ہمارے خاندان کا کوئی بچہ دودھ چھوٹنے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے جابر و ظالم لوگ بھی سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ جاہلیت کے شہسواران ادب نے زبان و بیان کے جوہر بکھیرے ہیں اور انھیں فصاحت و بلاغت میں تقدم و پیشوائی کا شرف حاصل ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تعصب، بے جا حمایت، انتقام اور آباء و اجداد پر فخر جیسے جاہلی عادات کی بناء پر ان کے کلام میں معنوی خامیوں کا ایک مرقع نظر آتا ہے۔ کجی فکر اور تنگ نظری زبان و ادب کے سرمایہ کو معیوب بنا دیتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وصف گوئی اور منظر کشی میں انھوں نے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے اور فخریہ شاعری میں بھی انفرادی مقام حاصل کر لیا ہے تاہم جاہلی شعراء کے کلام کی بڑی خامیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مثلاً امرؤالقیس کے معلقہ کو ہی لیجئے دیار حبیب کا تذکرہ کرتا ہے اور پھر اپنے اونٹنی کا وصف بڑے طمطراق انداز میں بیان کرتا ہے اس دوران وہ بڑی شان و شوکت اور کرّ و فر والا معلوم ہوتا ہے لیکن پھر وہ صحرائی سفر اور اپنے حالات زندگی کا تذکرہ کرتا ہے تو مفلس و قلاش معلوم ہوتا ہے۔ اس پورے سلسلۂ کلام کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلے جاہلی شاعری کے سلسلے میں یہ تاثر لینا پڑتا ہے کہ یہاں کوئی ربط نہیں ہوتا ہے شاعر خیالات کی مختلف وادیوں میں بھٹکتا ہے۔ دوسری بات جو خود شاعر کی ذات سے متعلق ہے وہ یہ کہ موضوع سے انحراف کے وقت کلام کے زور میں یکسانیت برقرار نہیں رہتی جس کے نتیجے میں شاعر کی شخصیت کہیں تو جاہ و حشمت کی ترجمان ہوتی ہے اور کہیں سے بے چارگی و افلاس کی شاہکار۔

اسی طرح جب عمرو بن کلثوم کا معلقہ شاعری زیر مطالعہ رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا کوئی کوئی حصہ تو بڑا ہی زور و وزن رکھتا ہے مثلاً اپنے قبیلے کی خالص تعریف میں اس کے جو اشعار "وقد علم القبائل سے ساجدین" ہیں ان کے ذریعہ حریف قبیلے کا نام و نشان مٹ گیا۔ لیکن جب ہم یہ اشعار فن کی میزان پر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں طفلانہ جذبات اور بچگانہ خیالات کا دریا موجزن ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ یہ اشعار ایجاز و اختصار کی روح سے خالی ہیں۔

چنانچہ ہم اس اعتراف سے گریزاں نہیں ہیں کہ جاہلی ادب زبان و بیان کے لحاظ سے

دوسرے تمام ادوار کے مقابلے میں سند کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود معنوی اور ظاہری خامیوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا کم از کم ادب کا ذوق رکھنے والا اور صحیح فکر کا علمبردار شخص تو ان کے فنی نقائص کو نظر انداز نہیں کرے گا۔

زبان و ادب پر قرآن کا سایۂ رحمت

بلاشبہ قرآن پوری انسانیت کے لئے ایسا ضابطۂ زندگی فراہم کرتا ہے جس سے ضلالت کی تاریکیوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور رشد و ہدایت کی شاہراہ نظر آنے لگتی ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اسی قرآن کی بدولت بادیہ نشینوں کی تقدیر بدل گئی۔ وقت کی ظالم اور مستبد حکومتوں نے ان کے قدم چوم لئے اور آج بھی مسلمان اس نسخۂ ہدایت کی بدولت اپنی زندگیوں کو انقلاب سے ہمکنار کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ زندگی کے جملہ معاملات میں ہدایت و رہنمائی کی کتاب تسلیم کر لیں۔ قرآن پاک کی عظمت کا دینی پہلو ہے جسے ہر مسلمان خواہ گورا ہو یا کالا، ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا، مشرق کا ہو یا مغرب کا بے چون و چرا تسلیم کرتا ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی یہ قرآن ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہے جو تمام تر فنی اور ادبی خصوصیات میں یکتا اور بے مثل ہے۔ جناب پی۔ کے ہٹی اپنی تصنیف "ہسٹری آف عربس" میں لکھتے ہیں:

"روحانی اور اخلاقی امور میں اسلام کی اساس اور قولِ فیصل وحی ہے اس لئے بڑا مذہبی اثر رکھتا ہے لیکن یہ اس کی تاثیر کا صرف ایک رخ ہے۔ مسلمان شریعت اور علم دینی دنیا کو ایک ہی شے کے مختلف پہلو سمجھتے ہیں لہذا قرآن مجید کتابی تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ اور علوم و حکمت کا دستور العمل ہے۔ جب ہم یہ حقیقت سمجھ لیں کہ محض اس کتاب کی بدولت عربی بولنے والی مختلف قوموں کی مقامی بولیاں جداگانہ زبانیں نہیں بننے پائیں جس طرح کہ ممالک یورپ میں رومانی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہو گئی تب اس کی عظیم ادبی حقیقت کا اندازہ کر سکیں گے۔" شه

صاحب المفید قرآنی عظمت کے پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ قول "ان القرآن اوّل ظاهرة نثرية فنية عند العرب" یہ فنی لحاظ تک ہی

محدود نہیں ہے بلکہ ادبی انقلاب کی وسعتوں کو بھی چھو لیتا ہے کیونکہ اس کا اسلوب اتنا دلکش ہے کہ اعجاز کی حد تک پہنچ گیا ہے اور یہ عربی زبان وادب اور حسن تعبیر کی اعلیٰ اور افضل مثال ہے۔ ۷

اگرچہ جملوں کی بندش، فصاحت و بلاغت، اور اسلوب بیان کی لذت و شیرینی کی بنا پر قرآن پاک کی قرأت منظوم کلام کے مثل کانوں میں رس گھولتی اور دلوں کی دنیا کو مسخر کرتی ہے لیکن یہ قرآن کی حقیقت شروع سے اخیر تک عربی نثر کا سرمایہ ہے اور اس لحاظ سے دوسرے تمام منثور کلام میں اولیت و افضلیت کا مقام رکھتا ہے کہ اس سے قبل کوئی باضابطہ نثری تالیف نہیں ملتی، یہی عربی کی کتاب دوسرے تمام ادبا عرب کیلئے ادب کے سفر میں نشان راہ فراہم کرتی ہے۔ حتی لکھتے ہیں:

AT THE TIME OF MUHAMMAD THERE WAS NO WORK OF THE FIRST ORDER IN ARABIC PROSE. TH QURAN WAS THERE FORE THE EARLIEST AND HAS EVER SINCE REMAINED THE MODEL, PROSE WORK .... ITS RHYMED PROSE HAS SET THE STANDARD WHICH ALMOST EVERY CONSERVATIVE ARABIC WRITER WRITER TODAY CONCIOUSLY STRIVES TO IMITATE. ۸

ترجمہ: عہد نبوی میں اس سے قبل عربی نثر کا باضابطہ سرمایہ موجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کو پہلا مدون عربی نثر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہی کتاب ہمیشہ نمونۂ نثر بنی رہی، اس نے ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے جس کی تقریباً ہر ایک قدیم مصنف آج بھی نقل اتارنے کی جد وجہد کرتا ہے۔

بہر حال قرآن چونکہ کتاب ہدایت ہے۔ اس کا ہر ہر حرف ایک اہم مقصد کے محور پر گردش کرتا ہے اور یہ کتاب کائنات کے رب کی نازل کردہ ہے جو تمام طرح کے شکوک و شبہات سے بالاتر ہے اور جس کی حفاظت کا ذمہ بھی اس نے نازل کرنے

والے نے لے لی ہے مزید یہ کہ یہ سب سے پہلا مدون اور مستند سرمایۂ نثر ہے۔ قرآنی عظمت کی ان وجوہات کے پیش نظر اس اعتراف حقیقت سے گریز کی نوبت نہیں آتی کہ قرآن دینی اور شرعی نقطۂ نظر سے ہادی و رہبر ہونے کے علاوہ عربی ادب کے شہ پاروں کو بھی ہدایت اور رہنمائی کے نقوش راہ فراہم کرتا ہے۔

چونکہ نزول قرآن کے بعد جاہلی افکار و خیالات کی بنیادیں بھی متزلزل ہونے لگی قرآن صحیح اور ہمہ گیر فکر و نظر کے نقیب کی حیثیت سے اپنے انوار کی تجلیاں بکھیر رہا تھا اور انسانی ضابطۂ حیات کو صحیح سمت عطا کرنے میں لگا ہوا تھا اس لئے جہاں عربوں کی سیاسی و سماجی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی وہیں ادبی و ثقافتی زندگی میں ایک انقلاب واقع ہو گیا۔ جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے نزول قرآن کے بعد اغراض و اہداف میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی ۸ مسلم شعراء نے بت پرستانہ صفت کو ترک کر دیا یعنی بتوں کی قسمیں کھانا، عصبیت کے کلمات کہنا، شراب کی وصف گوئی میں آسمان و زمین کے قلابے ملانا، اور جوش انتقام میں دیوانگی کی حد تک مظاہرہ کرنا۔ ان تمام اوصاف کی جگہ اسلامی معانی و مفاہیم نے لے لی مثلاً توحید، تقویٰ، جہاد اور جنگ۔ رہی اسلوب بیان کی بات، تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کی بندش اور تراکیب کی دلکشی میں قرآن پاک کا انتہائی اعلیٰ اور ارفع درجہ ہے اور اسی قرآن نے فضا سازگار کیا جس کے نتیجے میں قلیل مدت میں ہی عربی زبان جزیرۂ عرب کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی چھا گئی۔ ۹

مصادر و مراجع

۱۔ تاریخ الادب العربی۔ عمر فروخ۔ ص ۲۵۴، الجزء الاول بیروت طبع اول ۱۹۸۵ء

۲۔ دیوان امرؤ القیس۔ ص ۱۸–۱۹ دار المعارف مصر، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم

۳۔ دیوان اعشیٰ۔ ص ۲۲۳–۲۲۵، شرح و تعلیق م محمد حسین، مطبعہ نموذ

۴۔ روایتوں کے اختلافات کے ساتھ۔ جمہرۃ اشعار العرب۔ ابو زید القرشی ص ۱۳۶–۱۳۷

۸۔ HISTORY OF ARABS. P.K HITTI PAGE-127 SIXTH EDITION 1935 LONDON

باقی ص ۳۶ پر

انبیائی اسلوبِ دعوت

عبد الاول، عربی ہفتم، متعلم جامعۃ الفلاح

فریضۂ اقامتِ دین کی ادائیگی کے لئے ہر دور میں انبیائے کرام علیہم السلام نے دعوت کے طریقہ کو اپنایا ہے۔ آج بھی ہمیں وہی طریقہ اپنانا ہوگا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ سوالات ابھرتے ہیں کہ:

۱۔ انبیاء علیہم السلام پہلے کن لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں؟

۲۔ کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟

پہلے سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا آغازِ کار ہی میں وہ پوری قوم کو مخاطب کرتے ہیں یا ان کا تخاطب قوم کے کسی خاص طبقہ سے ہوتا ہے۔

دوسرے سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا انھوں نے سب کو منکر و کافر فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز "اے کافرو! ایمان لاؤ، اے مشرکو! ایمان لاؤ" سے کیا یا ان کا طرزِ خطاب کچھ اور تھا؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اولاً اربابِ اقتدار کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ بھی برحقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ولادت قوم کے معزز گھرانے میں ہوئی ہے اسی وجہ سے انھوں نے اولاً اپنے خاندان والوں تک دعوتِ اسلام پہنچائی ہے اور چونکہ قوم کی مذہبی پیشوائی پر یہی لوگ متمکن تھے اس لئے مناسب تھا کہ پہلے اپنے ہی خاندان والوں کو مخاطب کریں۔ معاً بعد اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھ میں باگ ڈور تھی اور جو اپنے آپ کو سب کچھ سمجھ بیٹھا تھا۔ اس کی متعدد مثالیں قرآن میں جا بجا ہم کو ملتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اولاً اپنے خاندان والوں کو دعوت دی۔ پھر آپ نے بادشاہِ وقت تک اپنی دعوت پہنچائی "الم تر الی الذی حاج ابراهیم فی ربه ان اتاه الله الملك"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے فرعونِ وقت کو مخاطب کیا "اذهب الی فرعون انه

طغی فقل هل لك الی ان تزكی واهديك الی ربك فتخشی" اور دیگر انبیاء نے بھی اپنی دعوت کا آغاز اربابِ اقتدار ہی سے کیا۔ ارشاد ہے: "وانذر عشيرتك الاقربين"

چونکہ انہی لوگوں کے ہاتھوں میں زمامِ کار تھی اس وجہ سے آپ نے دعوت کا آغاز انہی لوگوں سے کیا اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک حجت تمام نہیں ہوئی اس وقت تک اپنی دعوت کا سلسلہ برقرار رکھا اس کے بعد مضافات کے باشندوں تک دعوت پہنچائی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ حبشہ کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ دور دور سے آئے اور داخلِ اسلام ہوتے چلے گئے لیکن قریش کے سرداران ابولہب اور ابوجہل وغیرہ اس دعوت سے محروم رہ گئے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود آپؐ نے اپنی دعوت کی ترتیب نہیں بدلی۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کے لئے آپؐ نے دعوت کا جو طریقہ اپنایا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے سلاطین کے نام نامے لکھے۔ پہلے ان کو اسلام سے آگاہ کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ "اسلم تسلم" ورنہ تمہاری اور تمہاری زیر دستوں دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر آئے گی۔ بعد میں خلفائے راشدین نے بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر اپنی ذمہ داری ادا کی۔

اب رہا دوسرا سوال کہ انبیائے کرام علیہم السلام نے تخاطب کا کون سا طریقہ اپنایا ہے۔ تو یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اس زمانہ میں ہوتی ہے جبکہ چہار جانب باطل کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور روشنی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ایسے وقت میں بغیر وحی الٰہی کے حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا مستبعد نظر آتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حق صرف انبیاء کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس صورت میں ایک نبی دعوت دیتے وقت "اے کافرو! اے مشرکو!" جیسے خطابات کا حق رکھتا ہے اس کے لئے ان الفاظ کے ذریعے خطاب کرنا بجا ہے کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے [illegible] کچھ ہے وہ صرف کفر و شرک ہی ہے لیکن انبیاء دعوت کا یہ طرز اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کو "اے انسانو، اے لوگو، اے میری قوم، اے اہل کتاب، اے وہ لوگو جو یہود ہوئے، اے وہ لوگو جو [illegible] ہوئے، اے وہ لوگو جو ایمان لائے" وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتے ہیں البتہ ان کا یہ طرزِ خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ قوم ہٹ دھرمی پر نہ اتر آئے اور نبی کے درپے آزار نہ ہو جائے [illegible] یوں تو ہر نبی کی دعوت کا طرز ہمیشہ یہی رہا ہے لیکن بطورِ خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ خطاب قابلِ ذکر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے وقت کے بادشاہ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ہے ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو کافر و مشرک کی حیثیت سے خطاب کر رہے ہیں۔ لیکن جب دعوت و تبلیغ کی ایک لمبی مدت گزر گئی، انھوں نے قوم کے درمیان اپنی حجت تمام کر دی، اور ان کی ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کی درپے ہو گئی تو اس وقت انھوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا جیسا کہ ان کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے:

قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه .... حتى تؤمنوا بالله

(سورۃ الممتحنہ)

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ ہجرت سے پہلے کی کسی سورہ میں یہ نہیں مل سکتا کہ آپ نے اپنی قوم یا اہل کتاب کو صریح طور سے کافر و مشرک یا منافق کے الفاظ سے خطاب کیا ہو۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یا تو یا ایہا الناس کے الفاظ سے یا یا ایہا الانسان یا یا قوم کے الفاظ میں ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کے لئے یا اہل الکتاب یا اس کے ہم معنی الفاظ آئے ہیں یہاں تک کہ منافقین کے لئے فتح مکہ کے بعد تک وہی عام لفظ یا ایہا الذین آمنوا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو اے منافقو! کے الفاظ سے کہیں نہیں خطاب کیا گیا۔ لیکن جب ایک مدت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر حجت تمام ہو گئی اور نہ ماننے والوں نے قتل تک کا ارادہ کر لیا اس وقت آپ نے ہجرت فرمائی اور قریش کو صاف صاف اے کافرو! کے الفاظ سے مخاطب کیا اور ان سے اور ان کے دین سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ یہی وہ طریقۂ خطاب ہے جو انبیائے کرام نے اپنی عملی زندگی میں کر کے دکھایا۔

اب دیکھنا چاہیے کہ دعوت کا طریقہ کیسا ہو؟ تو ارشاد ہے:

ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن۔

(سورہ فصلت)

ترجمہ: "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے اور موعظت حسنہ سے بلاؤ اور لوگوں کے ساتھ ایسے طریقے سے جدال کرو جو سب سے اچھا طریقہ ہو۔"

اس آیت میں جو طریقۂ دعوت کے بارے میں قرآن کریم کی سب سے واضح اور سب سے جامع ہدایات پر مشتمل ہے، اللہ کے بندوں کو اس کی زندگی کی راہ کی طرف بلانے کے لئے تین اصول بتائے گئے ہیں:

۱۔ حکمت کا طریقہ، ۲۔ موعظت حسنہ کا طریقہ، ۳۔ جدال احسن کا طریقہ۔

"حکمت" کے معنی پکی بات کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ پوری طرح مدلل، مؤثر اور طمانیت بخش ہو۔

"موعظت حسنہ" کے معنی اچھی نصیحت کے ہیں۔ اچھی نصیحت اس کو کہتے ہیں جو اخلاص، شیرینی، دردمندی اور نصح و خیر خواہی کے جذبات سے بھری ہوئی ہو، جس کا انداز پُر اثر اور دلوں میں اتر جانے والا ہو۔

"جدال احسن" کے معنی بہتر انداز کے بحث و مذاکرات کے ہیں، یعنی بحث و استدلال کا ایسا طریقہ جو مقصد دعوت کے لحاظ سے موزوں ترین ہو، جس میں اسلوب و لہجہ کی شائستگی، کلام کی بلندی، استدلال کا حسن، انداز گفتگو کی کشش اور اثر انگیزی کا جوہر موجود ہو اور کج بحثی، طنز اور دل آزاری کا شائبہ تک نہ ہو۔ (تحریک اسلامی ہند، مولانا صدرالدین اصلاحی۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند)

دعوت کے یہ تینوں اصول طریقے درحقیقت تین مختلف قسم کے لوگوں کو پیش نظر رکھ کر متعین فرمائے گئے ہیں۔ پہلے طریقے کا تعلق اصلاً غیر مسلم افراد کو دعوت دینے کے کام سے ہے، دوسرے کا تعلق اصلاً خود مسلمانوں کے معاملے سے ہے اور تیسرے کا تعلق ان لوگوں سے، بالخصوص ان غیر مسلم افراد کے معاملے سے ہے جو بحث و مناظرے پر اتر آئیں۔

اس طرح یہ آیت طریق دعوت کے پورے مسئلے کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے اور صراحت کے ساتھ بتا دیتی ہے کہ کس قسم کے مخاطب کے ساتھ بنیادی طور پر دعوت و تلقین کا کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ ایک عام اور وسیع طریقہ جو عوام کے لئے سود مند ہو اور ان کے ذہن کے مطابق ہو اپنایا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھیں گے کہ لوگ ہماری طرف کھنچے ہوئے چلے آئیں گے اور ہم بھی اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے انجام دے سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا خادم بنائے۔ آمین۔ ●●

عورت کے چہرے کا پردہ

جناب محمد رفیق چوہدری صاحب

عورت کے پردے سے متعلق اکثر لوگ یہ غلط بحث کرتے ہیں کہ ستر اور حجاب میں کوئی فرق نہیں کرتے جبکہ شریعتِ اسلامیہ میں ان دونوں کے الگ الگ احکام ہیں۔ عورت کا ستر یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کے سوا اپنا پورا جسم چھپائے گی جس کا کوئی حصہ بھی وہ اپنے شوہر کے سوا کسی اور کے سامنے کھول نہیں سکتی۔ ستر کا یہ پردہ ان افراد سے ہے جن کو شریعت نے "محرم" قرار دیا ہے اور ان محرم افراد کی پوری تفصیل قرآن مجید کی سورۂ نور، آیت ۳۱ میں موجود ہے اور ان میں عورت کا باپ، اس کا بیٹا، اس کا بھائی، اس کا بھانجا اور اس کا بھتیجا وغیرہم شامل ہیں۔ ان محرم افراد سے عورت کے چہرے اور اس کے ہاتھوں کا پردہ نہیں ہے البتہ ان کے سامنے عورت اپنے سر اور سینے کو اوڑھنی یا دوپٹہ وغیرہ سے ڈھانپے گی۔ ستر کے تمام احکام سورۂ نور میں بیان ہوئے ہیں اور ان کی تفصیلات ہمیں احادیثِ نبوی میں مل جاتی ہیں۔ گھر کے اندر عورت کے لئے پردے کی یہی صورت ہے۔

مگر عورت کا حجاب اس کے ستر سے بالکل مختلف ہے اور یہ وہ پردہ ہے جب عورت گھر سے باہر کسی ضرورت کے لئے نکلتی ہے۔ اس صورت میں شریعت کے وہ احکام ہیں جو اجنبی مردوں سے عورت کے پردے کے متعلق ہیں۔ حجاب کے یہ احکام قرآن مجید کی سورۂ احزاب میں بیان ہوئے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ گھر سے باہر نکلتے وقت عورت جلباب یعنی بڑی چادر یا برقع اوڑھے گی تاکہ اس کا پورا جسم ڈھک جائے اور چہرے پر بھی چادر یا برقعے کا ایک پلّو ڈالے گی۔ اب وہ صرف اپنی آنکھ کھلی رکھ سکتی ہے باقی پورا جسم چھپائے گی۔ یہ چہرے پر نقاب کا حکم ہے۔ اجنبی مردوں سے عورت کا وہ پردہ ہے جسے حجاب کہا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں اسے گھونگھٹ نکالنا بھی کہتے ہیں۔

اس وضاحت کے بعد اب غور طلب امر یہ ہے کہ کیا گھر سے باہر نکلتے وقت عورت کے چہرے کا پردہ محض ایک رسم ہے جو "ملاؤں" نے ایجاد کر لی ہے یا یہ بھی قرآن مجید کا حکم ہے کہ مسلمان عورت اجنبی مردوں سے اپنے چہرے کا پردہ کرے گی؟ اس سوال کا جواب ہمیں سورۂ احزاب کی آیت ۵۹ سے مل جاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

اے نبیؐ! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور انھیں کوئی نہ ستائے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

سب سے پہلے اس آیت کے اصل الفاظ پر غور کیجئے۔ اس میں يُدْنِيْنَ کا لفظ آیا ہے جس کا مصدر اِدْنَاءٌ ہے اور عربی زبان میں اس کے معنی "قریب کرنے" اور "لپیٹ لینے" کے ہیں مگر جب اس کے ساتھ علیٰ کا صلہ آجائے تو پھر اس میں ارخاء کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ "اوپر سے لٹکا لینا"۔ دوسرا اہم لفظ جَلَابِيْبِهِنَّ ہے۔ جلابیب جمع ہے جلباب کی جس کے معنی رداء یعنی "بڑی چادر" کے ہیں۔ اور اس کے ساتھ مِن کا حرف آیا ہے جو یہاں تبعیض ہی کے لئے ہو سکتا ہے یعنی چادر کا ایک حصّہ۔ مطلب یہ ہے کہ عورتیں جب کسی ضرورت کے لئے گھر سے باہر نکلیں تو اپنی بڑی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیں اور ان کا ایک حصہ یا ان کا پلّو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ اُردو میں اسے گھونگھٹ نکالنا کہا جاتا ہے۔ اِدْنَاءٌ علیٰ کے الفاظ کا استعمال عربی زبان میں اسی مفہوم کے لئے ہے۔ جب کسی عورت کے چہرے سے کپڑا سرک جائے تو اسے دوبارہ چہرے پر لٹکا لینے کے لئے عربی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ:

اَدْنِىْ ثَوْبَكِ عَلٰى وَجْهِكِ　　اپنا کپڑا اپنے چہرے پر لٹکا لو۔

اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کے لئے چہرے کے پردے کا یہ حکم اجنبی مردوں سے متعلق ہے تو یہ مفہوم لینے کا واضح قرینہ اسی آیت کے ان الفاظ میں موجود ہے کہ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ یعنی جب عورتیں اپنے چہرے کا پردہ کریں گی تو اجنبی لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ شریف زادیاں ہیں۔ اسی طرح کسی بدباطن کو یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ ان کو چھیڑے یا ستائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح پہچانے کی اور چھیڑنے ستانے کی صورت گھر سے باہر کے ماحول ہی میں پیش

آ سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ بڑی چادر لینے کی ضرورت بھی گھر سے باہر ہی ہو سکتی ہے کیونکہ کام کاج کی وجہ سے عموماً گھر میں عورتیں بڑی چادریں نہیں اوڑھ سکتیں اور تیسرے یہ کہ گھر کے اندر عورت کے پردے کے بارے میں الگ سے حکم موجود ہے جو سورۂ نور کی آیت ۳۱ میں اس طرح آیا ہے کہ: ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن "اور عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں۔ گویا گھر کے اندر عورت کو چادر پہننے کی ضرورت نہیں، صرف اوڑھنی کافی ہو سکتی ہے۔ اور جب وہ گھر سے باہر نکلے گی تو بڑی چادر لے کر نکلے گی جس کا ایک حصہ اپنے چہرے پر بھی ڈال لے گی۔

امتِ مسلمہ کے تمام جلیل القدر مفسرین نے سورۂ احزاب کی اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

۱- حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی جو تفسیر بیان فرمائی ہے اسے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس طرح نقل کیا ہے کہ:

امر اللہ نساء المؤمنین اذا خرجن من بیوتھن فی حاجۃ ان یغطین وجوھھن من فوق رؤسھن بالجلابیب ویبدین عینا واحدۃ۔

اللہ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لئے گھروں سے نکلیں تو اپنی چادروں کے پلو اوپر سے ڈال کر اپنا منہ چھپائیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں۔

۲- ابن جریر اور ابن المنذر کی روایت ہے کہ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبیدہ السلمانی سے اس آیت کا مطلب پوچھا (یہ حضرت عبیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہو چکے تھے مگر حاضر خدمت نہ ہو سکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدینہ آئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھیں فقہ اور قضا میں قاضی شریح کے ہم پلہ مانا جاتا تھا) انھوں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی چادر اٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانک کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔

حضرت قتادہ اور سدی نے بھی اس آیت کے قریب قریب یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

۳- امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر "جامع البیان" جلد ۲۲ صفحہ ۳۳ پر اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ "شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھر سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی فاسق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔

۴- امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

فامر اللہ الحرائر بالتجلیب ...

... المراد یعرفن انھن حرائر لان من تستر وجھھا مع انہ لیس بعورۃ لا یطمع فیھا انھا تکشف عورتھا فیعرفن انھن مستورات لا یمکن طلب الزنا منھن
(تفسیر کبیر: ج ۶، ص: ۵۹۱)

اللہ تعالیٰ نے آزاد عورتوں کو چادر اوڑھنے کا حکم دیا ہے ..... اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدکار عورتیں نہیں ہیں کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے، اس سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اپنا ستر غیر کے سامنے کھولنے پر راضی ہوگی۔ اس طرح ہر شخص جان لے گا کہ یہ باپردہ عورتیں ہیں، ان سے زنا کی امید نہیں کی جا سکتی۔

۵- علامہ زمخشری جو کہ مشہور نحوی مفسر ہیں اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

یرخینھا علیھن ویغطین بھا وجوھھن واعطافھن۔
(الکشاف، ج ۲، ص ۲۲۱)

وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیا کریں۔

۶- علامہ نظام الدین نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن جلد ۲۲ ص ۳۲ پر اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"عورتیں اپنے اوپر چادر کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں۔ اس طرح عورتوں کو سر اور چہرہ ڈھانکنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

۷- مشہور حنفی مفسر ابوبکر جصاص اپنی تفسیر احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۵۸ پر اسی آیت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

قال ابوبکر فی هذہ الآیة دلالة ان المرأة الشابة مامورة بستر وجهها من الاجنبین واظهار الستر والعفاف عند الخروج لئلا یطمع اهل الریب فیهن۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کا حکم ہے۔ اور اسے گھر سے نکلتے وقت ستر اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ مشتبہ سیرت و کردار کے لوگ اسے دیکھ کر کسی طمع میں مبتلا نہ ہوں۔

۸۔ علامہ عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی اپنی تفسیر "تفسیر نسفی" میں اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

ومعنی یدنین علیهن من جلابیبهن۔ یرخینها علیهن ویغطین بها وجوههن واعطافهن۔

اور آیت کے الفاظ یدنین علیهن من جلابیبهن کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور اس طرح اپنے چہروں اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔ (تفسیر نسفی جلد ۳، ص ۳۱۳)

۹۔ مفتی محمد شفیع مرحوم اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"اس آیت نے بصراحت چہرہ کو چھپانے کا حکم دیا ہے جس سے اس مضمون کی مکمل تائید ہوگئی جو اوپر حجاب کی پہلی آیت کے ذیل میں مفصل بیان ہو چکا ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں اگرچہ فی نفسہ ستر میں داخل نہیں مگر بوجہ خوف فتنہ کے ان کا چھپانا بھی ضروری ہے، صرف مجبوری کی صورتیں مستثنیٰ ہیں۔" (معارف القرآن جلد ۷، ص ۲۳۴)

۱۰۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اسی آیت کے تحت اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں لکھا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کر زینت چھپانے ہی کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگھٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چھپ جائے۔" (تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۳۱)

۱۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"قرآن نے اس جلباب سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انھیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت نہ آئے۔ یہی جلباب ہے جو آج بھی دیہات میں شریف بوڑھی عورتیں لیتی ہیں جس نے بڑھ کر برقع کی شکل اختیار کر لی ہے۔" (تدبر قرآن جلد ۶ ص ۲۶۹)

۱۲۔ پیر کرم شاہ صاحب اپنی تفسیر "ضیاء القرآن" جلد ۴، ص ۸۵ پر اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"اے نبی مکرم! آپ اپنی ازواج مطہرات، اپنی دختران پاک نہاد اور ساری مسلمان خواتین کو یہ حکم دے دیں کہ جب وہ اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو ایک بڑی چادر سے اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹ لیا کریں تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ مسلمان خاتون ہے۔ اس طرح کسی بد باطن کو انہیں ستانے کی جرأت نہ ہوگی۔"

حضرات مفسرین نے سورۂ احزاب کی اسی زیر بحث آیت ۵۹ میں چہرے کے پردے کا حکم سمجھا ہے اور چہرے کا یہ پردہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے پیش نظر زنا اور زنا کے مقدمات و محرکات کی پیش بندی اور روک تھام ہے اور یہ حقیقت ہر شخص پر عیاں ہے کہ کسی جوان عورت کا چہرہ ہی سب سے زیادہ جاذب نگاہ اور صنفی محرک ہوتا ہے بالخصوص جب اسے غازہ و رنگ سے بھی خوب مزین کر دیا جائے۔ فقط چہرہ دیکھ لینے ہی سے عورت کے حسن و جمال کا اندازہ کر لیا جاتا ہے اور بغیر چہرہ دیکھے اس کے حسن و جمال کا تصور ممکن نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو اسلام محرکات کو ایک ایک کر کے ان کی مخالفت کرتا ہے وہ نامحرم عورت کو دیکھنے پر پابندی لگاتا ہے، اور غض بصر کا حکم دیتا ہے، وہ مرد اور عورت کو تنہائی میں یک جا ہونے سے روکتا ہے، وہ عورت کو کسی غیر مرد سے بات کرتے وقت لگاوٹ کا لہجہ اختیار کرنے سے منع کرتا ہے جو اس کی آواز کو، وہ چاہتا ہے کہ عورت نماز میں امام کو اس کی غلطی پر ٹوکنے کے لئے سبحان اللہ نہ کہے۔ عورت اپنی کوئی زینت بھی غیر مرد کو نہ دکھائے، وہ اسلام یہ کیسے چاہے گا کہ چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھا دی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے۔ اور نسوانی حسن و جمال کے مرکز چہرے کو چھپانے کا

کوئی ختم نہ دے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم سے، احادیث سے، صحابہ کرامؓ اور تابعین کے تعامل سے دونوں سے عورت کے چہرے کا پردہ ثابت ہے۔ البتہ خاص حالات اور مجبوری کی صورت میں عارضی طور پر یہ پابندی اٹھ بھی سکتی ہے کیونکہ اسلام کوئی جامد اور غیر عقلی مذہب نہیں ہے۔ ہنگامی اور جنگی صورتحال میں، حج کے مناسک ادا کرتے وقت اور علاج معالجے کی صورت میں اور زیادہ بوڑھی عورت کے لئے چہرے کے پردے میں رخصت دی گئی ہے مگر اصل حکم جو عام ہے اور سب کے لئے ہے وہ یہی ہے کہ اسلام میں عورت کے چہرے کا پردہ ضروری ہے۔ شریعت اسلامیہ نے اسی کا حکم دیا ہے۔ اب یہ مسلمان عورتوں کا کام ہے کہ وہ دین اسلام کے ایک حکم کی پیروی کرتے ہوئے اجنبی مردوں سے اپنے چہروں کا پردہ کیا کریں یا پھر اسلام کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغرب کی اندھی تقلید کرتی پھریں اور جو چاہیں کریں۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اس کی جواب دہ ہوں گی۔

■ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ■

(بشکریہ ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۸۸ء)

بقیہ: زبان وادب کی ترقی میں قرآن کا رول

لہ المفید فی الادب العربی۔ جوزیف الہاشم ص ۸۶ــ۸۷ الجزء الاول ۱۹۶۴ء بیروت

ته HISTORY OF ARABS P.K HITTI PAGE – 147, SIXTH EDITION, 1958 LONDON.

شه المفید فی الادب العربی۔ جوزیف الہاشم ص ۸۵ طبع اول ۱۹۶۴ء بیروت

شه تاریخ الادب العربی۔ عمر فروخ ص ۲۴۶ طبع اول ۱۳۸۵ھ بیروت

ساری دنیا جو خفا ہے تو خفا رہنے دو

ولی اللہ سعیدی فلاحی

میں بازار سے گزر رہا تھا۔ تمام لوگوں کے ریڈیو آن تھے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ریڈیو نے محلہ کا محلہ بیدار کیا ہے۔ پورا ماحول ایک ہی جیسی آواز سے گونج رہا تھا کہ اچانک یک آواز تمام لوگ چیخ اٹھے "آؤٹ" — میری سمجھ میں بات آگئی تھی۔ شارجہ میں ہند و پاک کے درمیان ایک روزہ کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔

دور جدید میں کھیل کافی اہمیت کا حامل ہے۔ امریکہ ہو کہ روس، انگلستان ہو کہ فرانس اور بھارت ہو کہ پاکستان ہر جگہ کھیلوں کو اہمیت دینے اور عالمی سطح پر ایک نمایاں مقام دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ کرکٹ ہو کہ ہاکی، فٹ بال ہو کہ والی بال، اور ٹینس ہو کہ باکسنگ، ہر ایک میں مہارت پیدا کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ آج کے سربراہان مملکت، وزرائے حکومت اور خاندان قوم وملت ان کھیلوں کو سراہتے اور کھلاڑیوں کی ہمت افزائی کرنے میں جوش وخروش سے حصہ لیتے ہیں۔ ان کھیلوں کے بین الاقوامی (INTERNATIONAL) ثقافتی مقابلے بھی ہوتے ہیں جن میں انعامات کی رقم کروڑوں ڈالر تک ہوتی ہے۔ کھلاڑیوں کو لانے لے جانے کا سارا نظم وانتظام بڑے اہتمام کے ساتھ منصوبہ بند طریقے پر کیا جاتا ہے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کا ذریعہ ہوائی جہاز ہوتا ہے نیز قیمتی ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد ہی کھلاڑیوں کی دھندلی صورت دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ نیز ان کی سرزمین پر ہر جگہ ان کی عزت وشہرت ہے، ان کی آؤ بھگت ہے اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ان کی نقل وحرکت کی پوری روداد نشر کی جاتی ہے۔ اور سے لگی سی خراش پر اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ میچ خواہ جیتیں یا ہاریں یا برابر ہو ایک متعین رقم پہ قبضہ جمایا رہتا ہے۔ نہ ہے تعجب اگر

ترقی اجاگر کر دار ادا کر دیا تو عوام کی محبت، کھلاڑیوں کی الفت اور سربراہان مملکت کی شفقت حاصل ہوتی ہے نیز اسپیشل پرائز جو لاکھوں روپے کی قیمت پر مشتمل ہوتا ہے۔ آنجناب کی خدمت میں بڑے ہی ادب اور سرور و شادمانی کی محفل میں پیش کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ان کے عاشق ہر وقت ان کے لئے اپنی پلکیں بچھائے رہتے ہیں۔ میچ خواہ انگلینڈ میں ہو یا آسٹریلیا میں اپنے معشوق کی ایک ایک حرکت اور جنبش کی مدد و داد کے لئے بے چین رہتے ہیں اور کامیابی پر خوشی و مسرت اور مٹھائیوں کی تقسیم ہوتی ہے اور شکست پر مایوسی اور مدہوشی اور بسا اوقات اس عشق کی راہ میں موت جیسی عظیم کامیابی سے سابقہ پیش آجاتا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ ان کھیلوں کا مقصد کیا ہے؟ اگر نہیں معلوم تو سربراہان مملکت سے پوچھ لیجئے۔ لیکن یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے ان سے آپ کی ملاقات ہو گی کیسے۔ وہ تو بہت بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ خیر ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں وہ لوگ خود ہی کہتے رہتے ہیں "کھیل (THE SPORTS CREATE GOOD WILL BETWEEN THE NATIONS) دو ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بناتے ہیں" ان کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ مشاہدات کی دنیا میں یہ بات مسلّم ہے کہ THE SPORTS CREATE "BAD WILL BETWEEN THE NATIONS" "کھیل دو ملکوں کے تعلقات کو ناخوشگوار بناتے ہیں" اگر ماضی سے شہادت لینی ہو تو ۱۹۳۶ء کے اولمپک کا ریکارڈ دیکھ لیجئے یا عام اصولوں پر پرکھ کر دیکھ لیجئے۔[1] آئیے اب چند اہم کھیلوں کی صورت حال کا مختصر جائزہ بھی لے لیا جائے۔

---

[1] برسوں پہلے ایک مشہور ادیب اور ناول نگار GEORGE ORWELL نے کتاب SELECTIONS FROM MODERN ENGLISH PROSE کے ایک سبق THE SPORTING SPIRIT میں کھیلوں کے ناخوشگوار نتائج پیدا کرنے پر ایک بہترین جائزہ پیش کیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر صرف حوالہ دیا جا رہا ہے۔ دیکھئے صفحہ [illegible]

● باکسنگ

زمانے کی ترقی کے ساتھ کھیلوں میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ کھیل پہلے محض کھیل ہوتا تھا جس میں ورزش یا کچھ تفریحی چیزیں شامل ہوتی تھیں لیکن اب تو ایک شخص دوسرے کو بے تحاشا مارتا، اعضاء و جوارح کی شکل میں خدا کی طرف سے عطا کی گئی عظیم نعمت کو ضائع کر دینا حتیٰ کہ موت کے گھاٹ اتار دینا کھیل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی قباحت و شناعت اور غیر سنجیدگی کا کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا۔[1] وہ تو اب لذت احساس بھی کھو بیٹھے ہیں۔ آج یہ کھیل امریکہ، انگلستان اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں کھیلا جا رہا ہے۔ اس سے خوشگوار تعلقات تو درکنار مزید کشیدگی ہی بڑھ رہی ہے۔ اس کھیل کے بھی عاشق بہت ہیں۔ مغربی عورتیں خاص طور سے اس کے پیچھے دیوانی ہیں۔

● فری اسٹائل

دیکھئے یہ بھی کیا غضب کا کھیل ہے۔ کوئی اونچائی سے اپنے مقابل پر کودتا اور اس کے جسم کو توڑ پھوڑ کر برباد کر دینا بھی ممکن کر دیتی ہے۔ یہ کھیل مختلف ممالک میں کھیلا جا رہا ہے۔ خاص طور پر مغربی ممالک کا تعاون خصوصی حاصل ہے۔ مغربی ممالک بڑے زور و شور سے اسے اپنے ٹیلی ویژنوں پر دکھاتے ہیں اور اس کے عاشق اپنے معشوق پر گھنٹوں نظریں جمائے کھڑے رہتے ہیں۔

● فٹ بال

فٹ بال بھی ایک اہم کھیل ہے۔ اس کا مقصد بھی دو ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرنا ہے۔ اس کھیل میں جو افراتفری اور تماشائیوں کے گڑبڑی ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ کھلاڑیوں کو زخمی کر دینا، ہوٹنگ کرنا اور گول کیپر کو ناکام بنا دینا اس کھیل کے ارکان و واجبات میں داخل ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلا فٹ بال میچ اسپین SPAIN میں ہوا وہ بھی دنگہ فساد سے خالی نہ رہ سکا۔ ہندوستان اور یورپ جیسے ممالک میں بغیر پولیس کے فٹ بال میچ کھیلنا ممکن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح کے دوسرے کھیل ہاکی، ٹینس اور جوڈو وغیرہ — کتنے کھیلوں کا ذکر کروں۔

---

[1] میونخ کے اولمپک کے بعد باکسنگ کی قباحت کی جانب کچھ نے توجہ دی، لوگوں کو تشویش ہوئی ہے جو خوش آئند بات ہے لیکن —— آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

کوئی بھی تو ایسا نہیں ملتا جس نے تعلقات کی خوشگواری میں ایک اچھا رول ادا کیا ہو۔

● کرکٹ

آیئے آج کے اس نرالے معشوق کا بھی تجزیہ کرلیں۔ بات تو کرکٹ سے چلی تھی اور دوسرے کھیلوں کی طرف نکل گئی۔ خیر، یہ بڑا نرالا معشوق ہے اور اس کے عاشق بہتیرے ہیں۔ وزیراعظم سے لے کر دیہات کے غریب ہل چلانے والے بوڑھے تک اس کے گرویدہ ہیں۔ نوجوان طبقہ ہو یا عمر رسیدہ لوگوں کا، بڑے لوگ اس کے دلدادہ ہیں اور اس کی وہ بلا ناز بانی، مال اور جان سب قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ جب کوئی شخص اس وادیٔ عشق میں قدم رکھتا ہے تو اسے تو کوئی بھی پتہ نہیں ہوتا نہ وہ ٹھیک سے کھانا کھاتا ہے، نہ سوتا ہے، نہ دین دنیا کی ہی اسے کوئی فکر ہوتی ہے۔

اس کھیل کا مقصد بھی دو ملکوں کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرنا ہے لیکن افراتفری، گروپ بندی، دنگا و فساد، عوام کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری اور تماشائیوں اور کھلاڑیوں کی آپس کی جھڑپیں تو اس کھیل کا طرۂ امتیاز بن چکی ہیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں آسٹریلیا کی ٹیم انگلینڈ گئی تھی۔ باوجود اس کے کہ یہ صدیوں پرانا کھیل ہے اور اس کی ابتدا انگلینڈ میں ہوئی، دنگا و فساد اور [illegible] جھگڑوں سے یہ میچ محفوظ نہ رہ سکا۔ کھیل روک دیا گیا اور حالات کے سنبھلنے میں کافی وقت لگا۔

آپ دور نہ جائیں تو بھارت اور پاکستان کی ٹیموں کا مشاہدہ کرلیں۔ خواہ میچ بھارت میں ہو یا پاکستان یا دنیا کے کسی بھی گوشے میں، عوام کے دو گروپ بن جاتے ہیں اور ذرا سی بات پر مارکاٹ اور قتل و خونریزی کی نوبت آجاتی ہے جس سے تعلقات میں کشیدگی اور فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے۔

میں اسے عشق سے بھی آگے ایک اور جہاں کا نام دیتا ہوں جس کا وجود اب تک نہیں تھا۔ کیونکہ عشق میں آدمی تو کبھی کبھی کام کی باتیں بھی کرتا ہے لیکن اس کے عشاق نے تو حد کر دی جب عشق کا زور ہوتا ہے تو ان کا دماغ خلاؤں میں سفر کرنے لگتا ہے اور بغیر قصد و ارادہ کے زبان سے وہی کچھ صادر ہوتا ہے جو دماغ میں پہلے سے جما ہوا تھا۔ ایک واقعہ ملاحظہ کیجئے:

سنہ ۱۹۸۳ء میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم بھارت آئی۔ سری نگر میں ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء کو کھیل ہوا

جس میں افراتفری اور چاقوزنی کی واردات کے علاوہ ایک دلچسپ بات پیش آئی وہ یہ کہ MAN OF THE MATCH کا مسئلہ زیر غور تھا۔ بورڈ بھارت و ویسٹ انڈیز کے کھلاڑیوں کے ناموں اور ان کی کارکردگیوں پر غور کر رہا تھا اور عوام کی مانگ یہ تھی کہ MAN OF THE MATCH عمران خان کو بنایا جائے۔ دیکھئے یہ عشق جب اپنے شباب کو پہنچتا ہے تو عاشق کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے البتہ اسے معشوق ضرور یاد رہتا ہے۔ یہ ہے وہ کھیل جس کے ذریعہ تعلقات کو بہتر بنائے جانے کا کھیل برسوں سے جاری ہے۔[1]

کھیل کے مہلک نقصانات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کھیل کا پہلا نقصان تو یہ ہے کہ اس سے جذباتی نفرت کے علاوہ تعلقات ناخوشگوار ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کھیلوں میں مال کا ضیاع ہوتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں۔ تیسرے یہ کہ وقت ایک انمول دولت ہے۔ ان کھیلوں میں یہ عظیم دولت برباد ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ارنالڈ (ARNALD) جو عوامی سکولوں کے بانی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، اسے وقت کا ضیاع ہی کہتے ہیں۔[2]

یقیناً کھیل ایک مفید چیز ہے لیکن اس کی ایک حد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحت کی تندرستی، قویٰ کی مضبوطی اور جنگی مہارت کے لئے جنگی مشق اور اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس سلسلہ میں ہمت افزائی بھی کی ہے کہ اس میں بیک وقت کئی فوائد ہیں۔

افسوس ہے اپنے کھیل کے کھلاڑیوں اور تماشائیوں پر۔ ہمارے مسلم ممالک بھی بغیر

---

[1] صفحات کی قلت کی وجہ سے بڑے اختصار کے ساتھ باتیں لکھ رہا ہوں۔ دنگا فساد کی نظیر ۲۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو ناگپور میں بھارت اور پاکستان کا میچ ہے پھر ۲۵ مئی ۱۹۸۷ء کو پاکستان اور انگلینڈ کا میچ اور پاکستان کا دورۂ بھارت اور احمدآباد کا ٹیسٹ میچ۔

[2] GEORGE ORWELL THE SPORTING SPIRIT SELECTION FROM MODERN ENGLISH PROSE. (Pag -61)

سوچے سمجھے اس کے پیچھے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں خدا، رسول اور آخرت کا ذرہ برابر بھی
احساس نہیں ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ یہ جوانی جو ہمارے نوجوان کھلاڑیوں اور تماشائیوں کو ملی
ہوئی ہے ایک دن بڑھاپے میں تبدیل ہو جائے گی اور وہ کفِ افسوس ملتے ہوئے کہیں گے
[illegible] یہ جوشِ جوانی کی یہ امنگ ـــ ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔ اور بڑھاپے
کے بعد موت بھی نزدیک ہے۔ اور موت کے بعد ابدی زندگی کا قیام یقینی ہے۔ اس میں کسی شک
کی گنجائش ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت ان سے بار بار ملامت سے سوال کرے گا اے میرے
بندو! تم نے اپنی دولت، اپنا قیمتی وقت کہاں لگایا۔ جوانی کے عزیز لمحات کس کام میں صرف
کئے۔ تو جناب ان نوجوانوں سے کیا جواب بن پڑے گا؟ اور یہ بھی بعید نہیں کہ خدا پوچھے
اے جاوید! شارجہ میں تمہاری آخری گیند پر امید و بیم کی کشمکش میں چار افراد جاں بحق
ہو گئے ان کے قاتل تم ہو۔ تو یہ کتنا بڑا سودا ہو گا ـــ ساتھ ہی ساتھ خدا ان تماشائیوں
سے بھی سوال کرے گا میں نے تمہیں عقل و فہم دی تھی، تم نے اس عقل سے فائدہ کیوں
نہیں اٹھایا اور اپنے وقت کو ضائع کیوں کرتے رہے؟ تو ہمارے ان ایجوکیٹڈ دوستوں
کی کیا حالت ہو گی؟ میرے بزرگو! میرے دوستو! دنیا چار دن کی ہے۔ یہ عمر جو ہمیں
ملی ہے یہ خدا کی جانب سے مہلتِ عمل ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ موت کا فرشتہ کب
آ جائے اور ہم خدا کے حضور حساب و کتاب کیلئے کب حاضر ہو جائیں ـــ ہم اپنا محاسبہ
کریں کہ ہم اپنی زندگی اور جوانی کس کام میں گزار رہے ہیں۔ خدا کے بتائے ہوئے قوانین
کے مطابق یا اپنے نفس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق۔

یقیناً کھیل کی یہ صورت حال قابلِ غور ہے، اس پر خصوصاً مسلمانانِ عالم اور عالمِ اسلام کو غور
کرنا چاہئے تاکہ اس کے تدارک کی کوئی صورت نکل سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کھیل
اور عیش و مستی ہم سے مٹ جائیں اور ان کے مضر اثرات سے ہمیں محفوظ رکھے۔ ہمارے
جان و مال اور اوقات کا صحیح مصرف ہمیں عطا کرے اور ہمارے وہ بھائی جو اس مہلک مرض
میں مبتلا ہیں انھیں اس سے نجات کاملہ بخشے۔ آمین۔

پاکستان کا گمنام شاعر

ابو سفیان اصلاحی ـ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ابھی جب (مئی ۱۹۸۸ء) پاکستان جانا ہوا تو وہاں کے بے شمار ادبا، شعرا اور ناقدین سے
ملاقاتیں رہیں۔ ہمارے یہاں پاکستانی تخلیقات بالخصوص شعراء کے کلام اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ ان
کے بہت سے مجموعے بھی ہندوستان میں چھپ چکے ہیں لیکن اس بار میری ملاقات ایک ایسے
شاعر سے ہوئی جسے ہندوستان میں کیا پاکستان میں بھی کم جانا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس
لئے کہ ٹیلیویژن اور ریڈیو کا طواف کرنے کی عادت نہیں، دوسرے غربت نے بھی اسے دیوارِ شہرت
پر چڑھنے سے روکے رکھا۔ وہ ایک درویش صفت اور گوشہ نشین انسان ہے۔ کراچی کے حبیب بنک
میں پروف ریڈر ہے۔ نہایت بااخلاق اور صاحبِ کردار ہے۔ اس گمنام شخص کا نام رسا چغتائی ہے۔
رسا چغتائی کے اب تک تین مجموعے زنجیر ہمسائیگی، ریختہ اور تصنیف آ چکے ہیں۔ ان کی
شاعری بڑی بے پناہ حیرت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے میر تقی میر کو اپنا آئیڈیل قرار دیا ہے
پاکستان کی پوری شاعری پڑھنے کے بعد یہی اندازہ ہوتا ہے کہ میر کو صرف دو شاعروں نے اپنی
ذات میں اتارا ہے۔ ایک ناصر کاظمی نے اور دوسرے رسا چغتائی۔ اگر رسا کو پاکستان کا دوسرا
ناصر کاظمی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ رسا کی شاعری میں ان کی اپنی ذات کا اظہار صداقت و
سچائی ہے۔ اپنے اندر کی آواز، دھڑکنوں اور نجی کیفیات کو سیدھے سادے انداز میں پیش
کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں صرف داخلیت کا گزر ہے۔ سلیم احمد نے درست
کہا ہے "رسا بنیادی طور پر ایک مخلص، دردمند اور سچا آدمی ہے۔" یہی اقدار اس کی
شاعری کو تصنع، سخن سازی اور نمائش پسندی سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کا شعر سن کر آپ
بے ساختہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسے آدمی کا شعر ہے جس نے اپنے تجربے اور
زندگی سے کبھی آنکھ نہیں چرائی اور اس میں جھوٹ کی آمیزش نہیں۔ وہ دردیلی غزل کی حسن کاری

اور اس کی علامات و رموز کی نزاکتوں سے بہت گہرائی میں واقف ہے اور اپنی شاعری میں ان سے کام لینا جانتا ہے۔ ان کی یہ قوت جب زندگی کے نئے تجربے سے ملتی ہے تو ایسے اشعار جنم لیتے ہیں جن میں غزل کا حسن حقائق سے ہم آمیز ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔"

رسا چغتائی کے یہاں تغزل کے ساتھ ساتھ انفرادیت ہے۔ لہجہ، اسلوب اور زبان ان کی شناخت ہے۔ نئے احساسات اور صنعتی عہد کی نہایت اچھی ترجمانی ہے۔ روایت سے انحراف کے نہیں اختلاف کے قائل ہیں۔ "رسا چغتائی کا کلام شستہ اور شائستہ طرزِ احساس کا سنگم ہے۔ غزل کے رچے بسے ہوئے لہجے میں عصرِ حاضر کی انفرادیت کا اظہار اور شائستہ اظہار ان کی شناخت ہے۔ ان کی شاعری میں اردو غزل کی روایت کو دورِ حاضر کے سیاق و سباق میں نیا لہجہ اور نئی جھنکار حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا کلام روایت سے عرفان اور نئی انفرادیت کے شعور کے ساتھ پڑھے جانے کا مستحق ہے۔"

انھوں نے غزلیں اور نظمیں دونوں کہی ہیں لیکن سچ پوچھئے تو وہ غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل میں اپنی کیفیات و احساسات کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ بیسویں صدی کی محرومیوں، مایوسیوں اور الم ناکیوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے وہ حقائق سے چشم پوشی کے قائل نہیں ہیں۔ اپنے تجربات کو سچ سچ بیان کر دینا فرض تصور کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار پڑھئے تو ان میں صنعتی عہد کا پورا چہرہ نظر آئے گا ۔۔

میرا اک چھوٹا سا گھر ہے — گھر کے اندر ایک شجر ہے
ایک شجر ہے جس کا سایہ — ننگے پاؤں ننگے سر ہے

گل کو پیغمبرِ شب کہتا ہوں — شب سے مفہوم خزاں ہے میرا
آنکھ جھپکوں تو رت بدل جائے — کیسے اپنے مشاہدات لکھوں

زندگی کس شجر کا سایہ ہے — موت کس دشت کی مسافت ہے
کون پوچھے یہ میر صاحب سے — ان دنوں کیا جنوں کی صورت ہے

ہائے کس خشک زباں سے پیتے — کہہ رہے ہیں کہ خزاں گزری ہے
شام ہی سے برس رہی ہے رات — رنگ اپنے سنبھال کر رکھنا

آ گئے ہو تو اس خرابے میں — اب قدم دیکھ بھال کر رکھنا

مشینی دور جہاں اپنے ساتھ بہت سے آسائش و تعیش کے سامان لے کر آیا وہیں اس نے ہمارا روحانی سکون غارت کر دیا۔ آسائش کے عوض ہمیں ذہنی کوفت، دربدری، ہجرت، خانہ بربادی اور تنہائی ملی۔ بیسویں صدی کا انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ وحشت و ظلمت اور خوف و ہراس اس کے جسم کا شعار بن چکے ہیں۔ رسا چغتائی کی شاعری میں یہ سارے احساسات موجود ملیں گے۔ جدید دور کے مسائل، جدید تقاضوں اور نئی نسل کی مایوسیوں کو غزل کی زبان میں پیش کیا ہے ۔۔

میں ہوا کی طرح اکیلا ہوں — وقت کے اس کھلے سمندر میں
عجب میرا قبیلہ ہے کہ جس میں — کوئی میرے قبیلے کا نہیں ہے
گھر کا مفہوم کہاں سے آیا — گھر میں دیوار کہاں سے آ گئی
جیسے تیسے سُلا کے بچوں کو — آن بیٹھا ہوں گھر سے باہر میں
رات پھر بھی رستا نہیں کٹتی — کاٹتا ہوں پہاڑ دن بھر میں
کس جہنم کا رزق ہوں جزا — کس لئے چن رہا ہوں انگارے
یہ صحرا ہے کہ شہرِ سامری ہے — میں آرزوؤں سے سر ٹکرا رہا ہوں

رسا چغتائی کے یہاں عشقیہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی اپنی انفرادیت اور اپنا رنگ و آہنگ ہے۔ روایتی انداز سے زیادہ تر انحراف کیا ہے۔ گل و بلبل سے غزل کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے یہاں سبک، آہستگی اور شگفتگی ہے۔ غزل کی نازبرداریوں کا خیال رکھا ہے۔ ان کے کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں وہ تنہا ہیں۔ محبوب کو نئے انداز اور نئے زاویے سے دیکھا ہے ۔۔

تیرے آنے کا انتظار رہا — عمر بھر موسمِ بہار رہا
چاند کس مہ جبیں کا پرتو ہے — رات کس زلف کی حکایت ہے
گھر سے شاید نکل پڑے وہ بھی — آج کچھ دھوپ میں تمازت ہے
دور آذروں سے صنم تراشے ہیں — کون رکھ دیتا ہے پتھر دیکھوں

ایک مراسلہ

فیاض احمد فلاحی۔ شعبۂ تخصص جامعۃ الفلاح

برادرم ولی اللہ سعیدی صاحب! سلام مسنون

امید کہ بخیر ہوں گے۔ برادر گرامی قدر ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ایک طویل مدت کے لئے ایک طویل سفر سے یعنی جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس سے وطن عزیز واپس آ گیا۔ اس سفر پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے منعقدہ دورۂ تدریبیہ اساتذہ کی غرض سے روانہ ہوا اور یکم جولائی کو عمرآباد پہونچ گیا۔

اس سفر میں جامعۃ الفلاح سے ہم تین اصحاب (مولانا علی مرتضیٰ فلاحی صاحب، انیس احمد فلاحی صاحب اور خاکسار) تھے۔ ۲ جولائی کو مدینۃ الرسول کے اساتذۂ کرام کا دس رکنی وفد بھی پہنچ گیا جو ان کی مستعدی کی واضح علامت ہے۔ ۳ جولائی کو دارالسلام کی درسگاہ کے وسیع ہال میں عرب شیوخ کے اعزاز میں استقبالیہ جلسہ تھا۔ جلسے میں دارالسلام کے لائق استاذ مولانا حفیظ الرحمن اعظمی صاحب نے عرب اساتذۂ کرام کی تشریف آوری پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا نیز دورۂ تدریبیہ کے جامعہ دارالسلام میں منعقد کئے جانے پر شکریہ ادا کیا نیز اس بات پر افسوس و دکھ کا اظہار کیا کہ اس دورے کے اصل روح رواں اور اس دورے کے انعقاد کرانے والے اب دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ بعدہ فضیلۃ الشیخ احمد المرزکی مدیر الدورۃ التدریبیۃ نے ذمہ داران دارالسلام کا شکریہ ادا کیا اور دورۂ تدریبیہ کے اہداف و مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ غلط عقائد و تصورات کا خاتمہ ہو اور اسلام کے صحیح اور خالص عقائد دلوں میں رچ بس جائیں۔ نیز فارغین مدارس کو اس انداز سے تربیت دینا کہ وہ مدرسین بن کے میدان میں صحیح طور سے امتِ مسلمہ کے فرزندوں کی تربیت کر سکیں۔ بدعات و خرافات سے پر ہندوستان میں داعیان و مبلغین اپنا فرض پہچانیں اور ان کے مٹانے کے لئے جد و جہد کریں۔

کون آتا ہے یہاں رات گئے / آج دیوار گرا کر دیکھوں
پا بہ زنجیر زلف یار رہی / دل اسیر خیال یار رہا
تجھ سے ملنے کو بیقرار تھا دل / تجھ سے مل کر بھی بیقرار رہا
نام جو بھی ہو نسب جو بھی ہو / تھی وہ اک شخص عجب جو بھی ہو
اس سے کہنا کہ کبھی آ کے ملے / ہم سے رنجش کا سبب جو بھی ہو

رسا چغتائی کی شاعری میں الفاظ و تراکیب کا استعمال بہت برمحل ہے انھیں تراکیب کے ذریعہ شعر میں معنویت اور حسن پیدا کرنے کا کمال حاصل ہے۔ تراکیب کا برتنا ایک فن ہے ان کی شاعری میں بہت سی تراکیب بالکل نئی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کریں ؎

طشتِ جاں میں سجا کے رکھتا تھا / حرفِ دل مہماں کے آگے
پہلے اس نے رسا چراغ دیا / اور پھر منصبِ وصال مجھے
سن اے منت کشِ صدائے جرس / اس طرف کارواں نہیں جاتا
ہم نے کس شہر سخن آباد کیا / گھر بنایا میرے گھر کی طرف
پھر وہی موسمِ شجر کاری / پھر وہی شاخِ بے ثمر تنہا
کیا ہوا اے بہار تازہ ہے / کیا چراغ سرائے حیرت ہے

ناصر کاظمی کو دوسرا میر کہا جاتا ہے۔ رسا چغتائی کی شاعری پر بھی میر کا زبردست پرتو ہے ان کے حالات، کیفیات اور شب و روز نے ایسے اشعار کہنے پر مجبور کر دیا، رسا کو حوادثات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ میر کے لہجے کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں ؎

در و دیوار چپ سادھے ہوئے ہیں / فقط اک عالم ہو بولتا ہے
وحشت کرے ہے کیا کیا / مژگان رہ گزر سے
بادہ کو اپنے ظالم / باندھا ہے کس ہنر سے
میرے کچے مکان کے اندر / آج تقریب چشم تر کی ہے
یہ شاد ہے یہاں کہاں سے آئے / یہ تو دہلیز میرے گھر کی ہے
آخر میرا کیسا ہو گا / کیا ہو گا ویرانی کا
باہر ایک تماشا ہے / اندر کی ویرانی کا
تیری زلفوں کا میری وحشت کا / ملتا جلتا ہے سلسلہ سا کچھ

نیز ہمارے دورے کا مقصد یہ بھی ہے کہ جو لوگ جامعہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں انھیں ان کے ملک ہی میں اس کا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ عرب اساتذہ کرام سے استفادہ کر سکیں۔ اسی کے ساتھ اس دورے میں ہم ذہین بچوں کا انتخاب بھی کرتے ہیں اور ان کو جامعہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ بعد ازاں دکتور الشیخ محمد علی مدیر کلیۃ الشریعۃ نے خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے عقیدۂ توحید کی اہمیت، مقصد تخلیق جن و انس اور شرک کی ہولناکی پر روشنی ڈالی۔ اس طرح یہ جلسہ اس اعلان کے ساتھ اختتام پذیر ہوا کہ دورۂ تدریب میں شرکت کرنے والے طلبہ تو انٹرویو کے لئے تعارف اسلام بلڈنگ میں جمع ہو جائیں۔ ہم لوگ جلسہ گاہ سے سیدھے اسی عمارت میں پہنچے۔ خدا خدا کرکے ہم لوگ انٹرویو سے آسانی فارغ ہوئے۔ حسن اتفاق ایسا کہ حقیر کو جمعہ ہی بنا لیا گیا۔ دو عرب اساتذہ کرام تیار بیٹھے تھے۔ علیک سلیک کے بعد نام دریافت کیا اور فوراً ایک سوال کیا کہ "اذ قلت اشہد ان محمدا رسول اللہ فماذا یترتب علیک؟" اس سوال کا جواب اللہ کے فضل سے میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں صحیح دیا یعنی جب ہم نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں تو ہم پر ان کی طاعت و متابعت کا فرض واجب ہو جاتا ہے۔ ہم پر واجب ہو جاتا ہے کہ ہم تمام ہی شعبۂ حیات میں رسول کریم کا اتباع کریں اور صرف نبی کے طرز عمل کو اپنا اسوہ بنائیں۔ بعد ازاں انھوں نے توحید کے متعلق دیگر سوالات کئے اور ایک کتاب سے مشہور حدیث حدیث جبرئیل پڑھوا کے اور اس کے متعلق سوالات کئے۔ تراکیب، مشتقات اور معانی و مطالب دریافت کئے۔ خدا کے فضل سے خاکسار جواب دینے میں کامیاب رہا۔ شام تک سبھی شرکت کرنے والے طلبہ انٹرویو سے فارغ ہو گئے۔ ۴ر جولائی کو باقاعدہ درس کا آغاز ہو گیا۔ درس صبح ساڑھے چھ بجے سے شروع ہو کر پونے ایک بجے ختم ہو جاتے۔ چالیس چالیس منٹ کی کل چھ گھنٹیاں تھیں۔ دو گھنٹی بعد ناشتے کے لئے وقفہ ہوتا پھر چار گھنٹیاں مسلسل ہوتی تھیں۔ پہلے دن کے درس میں تمام ہی اساتذہ کرام نے اخلاص نیت پر لیکچر دیئے اور حضرت عمر بن خطاب کی مشہور حدیث نیت "انما الاعمال بالنیات" الحدیث، کو موضوع بحث بنا کر اپنے اپنے جداگانہ انداز میں حدیث کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس سے ان کی حسن نیت اور سعی و جہد میں ان کے اخلاص کا پتہ چلتا ہے

اللہ تعالی ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔ ہفتے میں چھ گھنٹیوں میں کل دس موضوعات پڑھائے گئے تھے۔ (۱) تفسیر: ۴ گھنٹیاں (۲) حدیث: ۴ گھنٹیاں (۳) عقیدہ: ۴ گھنٹیاں (۴) نحو: ۴ گھنٹیاں (۵) نصوص و مطالعہ: ۴ گھنٹیاں (۶) سیرۃ الرسول: ۴ گھنٹیاں (۷) الاملاء والانشاء: ۳ گھنٹیاں (۸) ترجمہ: ۴ گھنٹیاں (۹) صرف: ۲ گھنٹیاں (۱۰) مصطلح الحدیث: ۲ گھنٹیاں۔

تمام ہی اساتذہ کرام اپنے اپنے فن پر بڑی دسترس رکھتے تھے۔ ان کی مشترکہ خصوصیت ان کا بہترین قرآن حافظ تھی۔ ان میں سے ان اساتذہ کرام میں خاص طور سے سیرت کے استاذ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نام ان کا خالد محمد الساعدی، قبیلہ ساعدہ کے چشم و چراغ ہیں۔ عربی زبان پر ان کی قدرت، حفظ و اتقان کے استعمال میں ان کی مہارت، آواز کی جہارت، اسلوب کی سلاست، ان سب سے بڑھ کر ان کے سوز و گداز ایک خاص حلاوت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مجھے ان کا وہ محاضرہ و لکچر یاد ہے جو انھوں نے حضرت عمر بن الخطاب اور حمزہ بن عبد المطلب کے اسلام لانے کے واقعے پر دیا، کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔ انھوں نے جس فصاحت و بلاغت اور اسلوب کی سلاست اور سوز و گداز میں اس واقعے پر روشنی ڈالی کہ آنکھیں ان کے اختتام پر اشکبار ہو گئیں اور دل بھر آیا۔

مجموعی طور پر تمام ہی اساتذہ کرام نے اپنے علم و فن کو ہم تک منتقل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ درس کے سمجھانے میں وہ اپنا پورا زور بیان اور صلاحیت صرف کر دیتے یہاں تک کہ طلبہ ان کی باتوں کو سمجھ جائیں اور ذہنوں میں ان کے پڑھائے ہوئے اسباق پوری طرح سے ثبت ہو جائیں۔ اس ضمن میں دینی مدارس کے اساتذہ کرام کی صورت حال کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ صورت حال اس وقت بہت ہی افسوسناک ہے۔ گھنٹی کے پورے اوقات درس میں صرف ہونا اس کی طرف سے سستی اور تساہلی ہو رہی ہے اولاً تو تاخیر سے آنا پھر درجے میں ایک ہلکی پھلکی مقدار پڑھانے کے بعد درس کو ختم کر دینا عام معمول سا بن کر رہ گیا ہے جبکہ عرب اساتذہ کا حال یہ تھا کہ گھنٹی بجتی نہیں کہ وہ آ موجود ہوتے اور پھر ایک منٹ ضائع کئے بغیر درس میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح وہ درس کو صرف پانچ چھ منٹ پہلے ختم کرتے اور ایسا اس لئے کرتے کہ وہ درس پر سوالات کا

موقع دیتے تھے طلبہ ان سے سوالات کرتے اور وہ تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کرتے۔ سوالات سے گھبرانے کے بجائے طلبہ کی ہمت افزائی کرتے پھر دوسرے دن اگلا درس شروع کرنے سے قبل سابقہ درس سے متعلق سوالات کرتے اور جواب طلب کرتے۔ اس طرح پچھلا درس طلبہ کے ذہنوں میں اچھی طرح مستحضر ہو جاتا۔ یہ تھا ان کے طرز تدریس کا ایک ہلکا پھلکا خاکہ۔ مناسب ہوگا کہ ان کے اخلاق وکردار پر بھی کچھ روشنی ڈالتا چلوں۔ پہلی خوبی ان کی یہ تھی کہ نماز ان کا اہتمام اور اس کے لئے پوری مستعدی ان کا وصف خاص تھا۔ حلم و بردباری فراست، راست بازی، اور عدل و مساوات کا بہترین نمونہ تھے۔ محنت، جد وجہد اور اپنے مقصد کے حصول کی کوشش نیز وقت کی پابندی ان کا خاص وطیرہ تھی۔ فقہی وگروہی تعصب سے دور تھے اور اپنے درسوں میں کئی بار ان اساتذہ کرام نے اس کا اظہار بھی کیا۔ تمام طلبۂ مدرسہ کو یہ تاکید بھی کرتے کہ دلائل وشواہد جس کے پاس ہوں اس کے قول کو اختیار کرنا انسب ہے۔

وہاں دو ماہ کے زمانۂ قیام میں طلبۂ دار السلام سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ بحمد اللہ طلبہ نے بہترین اخلاق وکردار کا ثبوت دیا ان کا پابندی سے درجہ میں جانا اور جامعہ کے قواعد وضوابط کی پابندی کرنا قابل تعریف ہے۔ رہن سہن میں صفائی وستھرائی کا خاص خیال رکھتے ہیں جو کہ مومن کا شیوہ ہے۔ علم سے ان کی دلچسپی، انجمن کے ہفتہ وار اجتماعات میں ان کا تحریر وتقریر میں مشق وتمرین کرنا، ان کے شوق علم پر دلالت کرتا ہے۔

ساتھ ہی دار السلام کی ایک نمایاں خصوصیت جسے ہم سبھی نے محسوس کیا اس کی فقہی رواداری اور مسلکی وگروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر غور وفکر کرنے کا انداز ہے جس کا ہمارے یہاں فقدان ہے۔ کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا گویا ہم جامعۃ الفلاح کے ماحول میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ فقہی رواداری جامعہ دار السلام کا طرۂ امتیاز بنی رہے۔ لیکن وہاں ہم لوگوں نے طلبہ میں ایک خامی بھی محسوس کی۔ اگلے درس کا مطالعہ وتیاری کا تصور ان میں مفقود ہے جب کہ مطالعہ وتیاری ہی طالب علم میں خود اعتمادی اور شوق علم میں اضافہ کا راز ہیں۔ اس چیز کے نہ ہونے سے لائق وفاضل اساتذہ کرام سے وہ اتنا زیادہ استفادہ نہیں ہو پاتا جو کہ مطلوب ہے۔ اگر طلبہ تیاری کر کے درجے میں حاضر

ہوں تو کچھ دنوں تک تو اساتذہ کو کچھ کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن طلبہ کو جو فائدہ ہوگا وہ ہمہ گیر ہوگا۔ اگر کسی کو لغت کی ضرورت آن پڑے تو وہ شاید ہی کسی کے پاس ملے گی کیونکہ طلبہ مطالعہ کے خوگر نہیں ہیں کہ لغات کے دیکھنے کا اہتمام کریں۔ ساتھ ہی خارجی مطالعہ بھی کم ہوتا ہے جس کے اسباب کیا ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے نیز اساتذہ وطلبہ کا تعلق روحانی باپ اور بیٹے کا ہے لیکن وہاں پر طلبہ اساتذہ کے تعلقات میں اس طرح کا معاملہ نہیں ہے جس سے لائق و فائق اساتذۂ کرام کا خاطر خواہ گرانمایہ علم طلبہ تک منتقل نہیں ہوتا جب کہ اگر اساتذہ وطلبہ کے تعلقات ایک دوسرے سے گہرے ہوں اور اصلاحی بنیادوں پر استوار ہوں تو کم صلاحیت والے اساتذہ کرام سے بھی طلبہ بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔

مجموعی لحاظ سے دورۂ تدریب کے طلبہ کے اندر جو کہ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے گئے تھے، ایک بات یہ محسوس کی گئی کہ ان سب کے اندر اعلیٰ اخلاقی صفات کی جو اسلام کے فرزندوں کے اندر ہونی چاہئیں، کمی ہے۔ شاید یہ مدرسہ کے نظام تربیت کے بہتر نہ ہونے کی بنا پر ہو۔ وہاں پر کیرالا اور دوسرے مدارس سے آئے بہت سے متعصب اور کٹر مسلکی بھائیوں سے بھی سابقہ پڑا جنکی فکری حالت پر ترس آتا ہے، ان کا کام اب ایسا لگتا ہے کہ ایک دوسرے کو ضال ومضل بتانا اور کچھ خاص چیزوں کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرنا ہی رہ گیا ہے۔ ھداھم اللہ۔

جامعہ کے سابق استاذ محترم مولانا علیم الحق صاحب، جو کہ عمر آباد کے ہی رہنے والے ہیں، برابر ملاقات رہی۔ استاذ محترم نے توقع سے زیادہ ہم لوگوں کی قدر کی۔ ان کی وجہ سے ہم لوگوں کو بہت حوصلہ ملا۔ انھوں نے ہم لوگوں کو اپنی شفقت ومحبت سے نوازا۔ محترم نے جامعۃ الفلاح کا جب بھی ذکر کیا خیر خواہی کے جذبہ کا اظہار کیا۔ یہاں کی ترقیوں، تبدیلیوں اور تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ جامعہ میں عربی بولنے کا ماحول پیدا ہوا کہ نہیں۔ ان کو یہ بتلائے جانے پر افسوس ہوا کہ ابھی تک تو کوئی خاص پیش رفت اس سمت میں نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے بار بار جامعہ میں عربی کے بولے جانے پر زور دیا۔

دورۂ تدریب کے اختتام پر ہم لوگ وہاں کے تاریخی مقامات (سرنگاپٹم، میسور) مشہور شہر (بنگلور اور مدراس) کی سیر وتفریح کے بعد ۲۸ اگست کو مادر علمی کی آغوش میں آ حاضر ہوئے۔ ●●

تابش مہدی

الحسنات کا "مولانا عبدالحیؒ نمبر"

ایڈیٹر: عبدالملک سلیم ، کتابت وطباعت: مناسب
کاغذ: اخباری ، صفحات: ۲۱۲ ، قیمت: ۱۲ روپے
پتہ: ادارہ الحسنات ۔ رام پور ۔ ۲۴۴۹۰۱ یوپی

دین پسند اہل علم طبقے کے لیے مولانا ابوسلیم محمد عبدالحی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے ادارہ "الحسنات" کے ذریعہ تقریباً ۴۲ سال تک ملت اسلامیہ کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا عبدالحی صاحب ایک منجھے ہوئے اہل قلم، تجربہ کار صحافی اور ممتاز مصنف کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ ایک ایسا عظیم انسان جسے اللہ تعالیٰ نے وہ دھڑکتا ہوا دل دیا تھا جو انسانی برادری کے ہر درد و غم پر تڑپ اٹھتا تھا۔ انھیں دیکھ کر قرن اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ مرحوم جماعت اسلامی ہند کے اولین ارکان میں سے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ان کی پوری زندگی اجتماعیت اور تحریک کے لئے وقف ہے۔ کبھی بھی ان کی نظر سے یہ بات اوجھل نہیں ہوتی تھی کہ وہ تحریک اقامت دین کے داعی اور رکن ہیں۔

راقم الحروف نے ان سے جب بھی ملاقات کی ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے کسی عزیز قریب سے مل رہا ہے۔ اجنبیت اور بے گانگی کی دیوار کبھی بھی درمیان میں حائل نہیں ہوئی۔

مدیر وکارکنان ادارہ کا یہ عمل واقعی لائق تحسین ہے کہ انھوں نے ادارے کے بانی و مدیر اول کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "مولانا عبدالحی نمبر" کی صورت میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر دیا۔

یوں تو زیر نظر شمارے کے تمام ہی مضامین لائق مطالعہ ہیں لیکن جناب عبدالمغنی، جناب اسعد اسرائیلی، جناب مائل خیرآبادی، جناب مرتضیٰ ساحل تسلیمی، جناب سید مستفیض الحسن،

جناب محمود عالم اور مدیر عبدالملک سلیم کے مضامین بالخصوص اس قابل ہیں کہ انھیں بار بار پڑھ کر روح میں بالیدگی اور ایمان میں تازگی پیدا کی جائے۔

جناب اسعد اسرائیلی کے مقالہ کی یہ آخری سطور پڑھتے وقت آنکھیں بھیگ گئیں اور دل بے قابو ہو گیا:

"ابا جان! میں نے ایک بار آپ کو مولانا مودودیؒ کی وفات پر لکھا ہوا اپنا ایک مضمون "سیدی مرشدی الوداع" سنایا تھا۔ حالانکہ آپ جذباتی شخص نہیں تھے مگر اس دن آپ کی آنکھوں کے گوشے بھیگ سے گئے تھے۔ آپ ایک لفظ بھی نہ بولے تھے بس میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں آج تک نہ سمجھ سکا کہ وہ میری حوصلہ افزائی تھی یا میری غم گساری۔ لیکن آج آپ کے لئے جو مضمون میں لکھ رہا ہوں اس کے لئے میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں ابا جان! کہ آپ مجھے ساری زندگی بہت یاد آئیں گے۔" (ص ۶۹)

جناب مرتضےٰ ساحل تسلیمی نے مولانا مرحوم کی ڈائریوں اور گفتگوؤں کے حوالے سے جو یادداشتیں قلمبند کی ہیں وہ خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ محترم مائل خیرآبادی اور مستفیض الحسن صاحب کے ذاتی مشاہدات پڑھ کر بے ساختہ یہ شعر زبان پر آ گیا:

پیدا کہاں ہیں ایسے فرشتہ صفات لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اس خصوصی شمارے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے تقریباً تمام ہی مضامین وابستگان ادارہ کے قلم سے ہیں۔ البتہ یہ بات ذرا کھٹکی کہ بیشتر مضمون نگاروں نے مولانا عبدالحی صاحب سے زیادہ اپنی شخصیت کو نمایاں و ممیز کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس نمبر میں منظوم حصہ مجموعی طور پر تین صفحات سے زیادہ نہیں لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس لئے کہ کوئی ایک بھی نظم ایسی نہیں ہے جسے فنی و ادبی سقم سے پاک و منزہ کہا جا سکے۔ مثلاً:

دورِ عالم میں وہ حسنات کے بانی ٹھہرے
شمع اسلام کو وہ نور دکھانے والے
(ص [illegible])

پہلے مصرعہ میں "حسنات" کی "سین" کو ساکن پڑھئے تب وزن درست ہوتا ہے حالانکہ سین متحرک ہے۔

تم تو خوش ہو وہاں مالک کے حضور عبد الحی

رہ گئے ہیں یہاں ہم رونے رلانے والے   ص۳۴

پہلا مصرعہ بحر سے خارج ہے۔ عبد الحی کی "عین" تقطیع سے گر رہی ہے۔

جو مئے عرفانیت سے مست کرتا تھا ہمیں

دین و ایماں کا وہی تو ساقیا جاتا رہا

پہلے مصرعے میں "عرفانیت" کا نہیں "عرفان" کا محل تھا۔ دوسرے مصرعے میں لفظ "ساقیا" ساقی (پلانے والا) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے حالانکہ "ساقیا" کے معنی "اے پلانے والے" کے ہوتے ہیں۔

(۱) اپنی تحریروں میں جو کہ درس دیتا تھا ہمیں

(۲) مانگتا جو کہ نہ تھا کچھ بھی صلہ جاتا رہا   ص۱۲۹

ان دونوں مصرعوں میں "کہ" کو "کہ" کے بجائے "کے" پڑھئے تب وزن درست ہوتا ہے ورنہ درست نہیں ہے۔

پورے شمارے میں جہاں بھی مولانا عبد الحی صاحب کا نام آیا ہے لفظ "حی" کے اوپر جزم (ْ) پڑھنے کو ملا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ تشدید (ّ) ہونا چاہئے۔

"مولانا (مودودیؒ) کی کتاب دینیات کے ذریعہ آپ نے تجدید و احیائے دین کی تھی" ص۱۱

یہاں تجدید و احیائے دین نہیں "تجدید ایمان" لکھنا چاہئے تھا۔

محترم سید مستفیض الحسن صاحب ۸۲ء سے پہلے جماعت کے باضابطہ رکن تھے پھر کسی وجہ سے ان کی علیحدگی عمل میں آگئی۔ موصوف نے مولانا مرحوم کے تعلق سے بعض باتیں ایسی لکھ دی ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"حالانکہ ایک جلسے میں معلوم ہوا کہ مولانا (عبد الحیؒ) بھی شوریٰ کے رکن نہیں رہے۔"

اس سے پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ مولانا نے جماعت کے نظم سے بیزار ہو کر رکنیت شوریٰ سے استعفیٰ دے دیا یا ارباب جماعت نے انھیں برطرف کر دیا حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ ایمرجنسی کے بعد جب میقات پوری ہو گئی تو حسب معمول از سر نو امارت، مجلس شوریٰ اور مجلس نمائندگان کا انتخاب عمل میں آیا اور اس بار کے انتخاب میں مولانا نہیں آ سکے۔

یہ تو اکثر ہر انتخاب کے موقع پر ہوتا رہتا ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو پچھلے انتخابات میں برابر آتے رہے ہیں نئے انتخاب میں نہیں آ پاتے۔ اس میں کسی قسم کی کنویسنگ اور ترغیب کا دخل نہیں ہوتا اور نہ جماعت میں اس کی اجازت ہی ہے۔

ایمرجنسی کے دوران جن ارکان کی طرف سے دستور اور نصب العین سے متصادم شکایتیں موصول ہوئیں، جماعت نے ضروری کارروائی کے بعد انھیں جماعت سے الگ کر دیا۔ محترم مستفیض الحسن صاحب کو اس پر بھی اعتراض ہے حالانکہ یہ چیز جماعت کے لئے بہت ناگزیر ہے۔ جس شخص کو جماعت کے نصب العین سے دلچسپی نہ ہو یا وہ دستور کی پابندی سے قاصر ہو اسے جماعت میں باقی رکھنا جماعتوں کی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

حاصل تبصرہ یہ ہے کہ الحسنات کا مولانا عبد الحیؒ نمبر غیر معمولی وقیع اور معیاری نمبر ہے اور اس کا مطالعہ عالم و فاضل، عام و خاص اور طلبہ ہر ایک کے لئے مفید ہوگا۔ بلاشبہ یہ اس قابل ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر عام کیا جائے اور لائبریریوں اور کتب خانوں کی زینت میں اضافہ کیا جائے۔ ••

اخبارِ علمیّہ

عالمِ اسلام میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ پر ایک بین الاقوامی سیمینار

جامعۃ الامام بن سعود عالمِ اسلام میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جامعہ کے مدیر جناب ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی نے کہا ہے کہ جامعہ شریعتِ اسلامی اور اس کے نفاذ سے متعلق دنیا میں جہاں سے کہیں کچھ بھی مواد میسر ہے اسے حاصل کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ خواہ یہ مواد مضامین و مقالات اور علمی رسائل و مجلات کی شکل میں ہو یا کانفرنس اور سیمینار کی شکل میں۔

مدیر جامعہ نے اس سیمینار کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سیمینار کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہر زمانے میں شریعت اسلامی کا نفاذ ضروری ہے اور اسے ضروری بنایا جائے، دوسرا یہ کہ شریعتِ اسلامی کے نفاذ کا اثر اصلاحِ معاشرہ کی صورت میں سامنے آئے، تیسرا یہ کہ شریعتِ اسلامی کے نفاذ کا اثر جرائم کی روک تھام کی صورت میں سامنے آئے، چوتھا یہ کہ شریعتِ اسلامی کے نفاذ کا اثر معاشی، اجتماعی، انفرادی اور ذہنی مشکلات و رکاوٹوں کو دور کرنے کی صورت میں سامنے آئے اور ساتھ ہی ساتھ سعودی عرب میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ سے جو شکوک و شبہات اٹھائے جا رہے ہیں ان کا دفاع بھی کیا جائے۔

اس موضوع پر اہم علمی و دینی شخصیات سے مقالات لکھوائے جا رہے ہیں تاکہ موضوع سے متعلق سیر حاصل بحث سامنے آسکے۔ اس سیمینار میں پیش کئے گئے عمدہ مقالات پر جامعہ کی طرف سے انعامات بھی دیئے جائیں گے۔ اور مقالات کو شائع کیا

جائے گا تاکہ یہ مقالات دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچ سکیں اور لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ (اخبار العالم الاسلامی۔ ۱۵ر صفر ۱۴۰۹ھ ص ۲)

ایک اسلامی عالمی کانفرنس

۸ تا ۱۱ ستمبر کے دوران جورج ٹاؤن۔ جویانا میں ایک اسلامی عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس میں مختلف اسلامی اداروں اور مراکز کے نمائندوں کے علاوہ علماء کی ایک اچھی تعداد نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا موضوع "العقیدۃ الاسلامیۃ الموحدۃ والانضباط" تھا۔

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ جویانا میں مسلمانوں کی تعداد ۵ ہزار ہے اور ۱۹۶۰ء میں ان کی ایک جمعیت بھی قائم ہو چکی ہے۔ (اخبار العالم الاسلامی۔ ۱۵ر صفر ۱۴۰۹ھ ص ۲)

ایک اہم عالمی ادارے کا قیام

ازہر ایک ایسے ادارے کے قیام کا ارادہ رکھتا ہے جس کا مقصد دین اسلام کا دفاع کرنا اور اسلام دشمن عناصر کی جانب سے کئے گئے اعتراضات کا مسکت جواب دینا ہے۔ ڈاکٹر رؤف شلبی جو ارکین ازہر میں سے ہیں نے کہا ہے کہ یہ ادارہ بالکل آزاد ہوگا یعنی اس کا نہ تو سیاست سے کوئی تعلق ہوگا اور نہ ہی کسی تحریک سے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ دینِ اسلام کی حفاظت کرے، علمی و تحقیقی چیزیں سامنے لائے اور ان شکوک و شبہات کا ازالہ کرے جو دشمنانِ اسلام، اسلام کے بارے میں پیدا کرتے ہیں۔ اس ادارہ کے قیام کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔ (اخبار العالم الاسلامی ۱۵ر صفر ۱۴۰۹ھ ص ۲)

مدرید میں ایک اسلامی ادارے کا قیام

سعودی عرب کے بادشاہ جناب فہد بن عبدالعزیز نے مدرید میں ایک اسلامی اور ثقافتی ادارے کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔ یورپ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ ہوگا۔ اس ادارے کے قیام کے لئے ملک فہد حفظہ اللہ نے ۱۰ ملین ڈالر کی اچھی رقم عنایت کی ہے اور کہا ہے کہ میں یہ ادارہ مسلمانانِ یورپ کو بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں۔

فہد بن عبدالعزیز کی جانب سے اسپین میں مقیم سفیر جناب محمد نوری نے کہا ہے کہ اس ادارے کا نظم و انتظام رابطہ عالم اسلامی کے سپرد ہوگا۔

(اخبار العالم الاسلامی ۱۵ر صفر ۱۴۰۹ھ ص ۲)

حلقۂ یاراں

عزیزی ولی اللہ سعیدی سلمہٗ!

حیات نو الحمد للہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید SUBLIMITY عطا فرمائے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ عنایت اللہ سبحانی صاحب کا وہ کلام جو انھوں نے قرآنی دعوت اللہ ریسرچ کیلئے ہے اس کو بھی حیات نو میں لائیے میری ان سے بات ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ مجھے عرصے سے کتابوں کی داڑھی پر شکوک و شبہات لاحق ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مغربی ورثہ مثل جمہوریت جو آجکل بہت عام ہے اسے ہمارے اکابرین نے کچھ اسلامیا ہے مگر وہ قباحت چھپا کے ہوئے ہے۔ داڑھی اور اس سے پروردہ افراد کی زندگیاں سامنے ہیں اس لئے اس میں قباحت محسوس کر رہا ہوں۔ اسلام میں داڑھی کا کیا مقام ہے؟ بھائی مفتی عبدالرؤف صاحب سے استفسار کیجئے اور مجھے مطمئن کیجئے۔ بھائی نور محمد صاحب فلاحی اور دیگر رفقاء کو سلام و دعا۔

فقیر محمد۔ کانپور

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ایڈیٹر حیات نو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے بخیر ہوں۔

"دارالرعایۃ الاسلامیہ: نمسا" کے ایک جریدہ نے لکھا ہے کہ ایک تجارتی کمپنی نے عورتوں کے لئے ایسے اندرونی لباس تیار کئے ہیں جن پر سورہ طلاق اور دوسری سورتوں کی آیات کریمہ چھپی ہوئی ہیں۔

مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے اور اسلام کو نیچا دکھانے کے لئے یورپی ممالک کی کمپنیاں اور تجارتی ادارے کپڑوں اور جوتوں پر قرآنی آیات اور دوسری قابل احترام چیزیں چھاپ رہی ہیں۔ ایسی ذلیل حرکتیں ان کی عادت بن چکی ہیں لیکن

باقی صفحہ پر

جامعہ کے لیل و نہار

ایک مذاکرہ

جماعت اسلامی حلقہ جامعہ کی جانب سے "تفسیر قرآن میں حدیث کا مقام" کے موضوع پر ایک مذاکرہ رکھا گیا جس میں جامعہ کے متعدد اساتذہ و طلبہ نے حصہ لیا۔ ماشاء اللہ یہ مذاکرہ نہایت کامیاب رہا۔ موضوع کے متعلق مختلف انداز سے کافی مفید چیزیں سامنے آئیں جن میں اساتذہ کی رایوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئی چیزیں بھی سننے کو ملیں۔ اس طرح کے علمی مذاکرات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جماعت کا اس نوعیت کا یہ قدم یقیناً لائق تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید ترقی دے۔ آمین۔

اس مذاکرے کا اختتام صدر مجلس استاذ محترم جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کی دعا پر ہوا۔

جامعہ میں شجر کاری

ابھی چند دنوں قبل جامعہ میں وسیع پیمانے پر تقریباً ایک ہزار پودے لگائے گئے ہیں۔ یہ پودے D-8-3-5 بلریا گنج جناب محمد ایوب صاحب کے تعاون سے حاصل کئے گئے ہیں۔ درخت کے فوائد بیشمار ہیں۔ سایہ، سکون، دلفریبی، خوشنما منظر اس کے اہم فوائد ہیں جو حصول تعلیم میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جامعہ کی اس شجر کاری کو ایک "پختہ رو کاج" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وہ یوں کہ جہاں اس سے ایک طرف متذکرہ بالا اہم فوائد کا حصول ہے وہیں دوسری طرف بھارت سرکار کی ہر بچہ ایک پودا پر عمل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان ننھے پودوں کو مضبوط و تناور درخت بنائے تاکہ حصول تعلیم کے لئے مزید سہولتیں فراہم ہو سکیں۔ آمین۔

فارغین تجوید

دینی مدارس کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جہاں قرأت و تجوید کی تعلیم ایک خاص شعبے کے اندر محصور کر دی گئی ہے۔ شعبۂ حفظ کے علاوہ دیگر شعبہ جات میں اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی جاتی حتی کہ عربی درجات کے طلبہ قرآن مجید کی تعلیم تو حاصل کرتے ہیں لیکن قرآن مجید کو صحیح ڈھنگ سے نہیں پڑھ پاتے۔ اس کمی کا احساس انھیں اس وقت ہوتا ہے جب وہ میدان عمل میں آتے ہیں خصوصاً امامت کے موقع پر انھیں شدید ندامت و خفت

اور ترقی بھی ہے۔ مزید یہ کہ وہ علم کی پریشانی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

الحمد للہ جامعۃ الفلاح نے اپنی اس کمی کو ایک حد تک دور کر لیا ہے جس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ شعبہ حفظ و تجوید کے علاوہ عربی درجات میں بھی قرأت و تجوید کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ماشاء اللہ طلبہ بھی اس جانب خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شعبہ کو مزید ترقی دے۔ آمین۔

اس سال پانچ طلبہ نے تجوید کی تعلیم مکمل کی ہے۔ یہ فارغین تجوید کا دوسرا گروپ ہے۔ بحمد اللہ اس گروپ کی فراغت کے موقع پر ایک نشست رکھی گئی جس میں متعدد اساتذہ و طلبہ نے شرکت کی۔ تجوید کے استاذ جناب قاری تابش مہدی صاحب ہیں۔ فارغین کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں:

۱: عارف حسین، ۲: محمد خالد بدایونی، ۳: محمد اکرم، ۴: عبد المالک، ۵: عبد الرحمٰن۔

مصباح العلوم چوکنیا میں جامعہ کی زیر نگرانی امتحان

جامعۃ الفلاح مخصوص فکر کا حامل ایک تحریکی ادارہ ہے جس کا مقصد دین اسلام کو اس روئے زمین پر غالب کرنا اور اقامت دین کی خاطر داعیانِ اسلام پیدا کرنا ہے۔ اسی کے پیش نظر اس نے ایک صالح نظام تعلیم و تربیت قائم کر رکھا ہے جس پر وہ عملاً گامزن ہے۔ مزید برآں وہ اپنے اس مخصوص فکر کی ترویج و اشاعت اور اس عظیم مقصد کی تکمیل و اقامت کے لیے اپنے ہم فکر و اخلاق کے خواہش مند تعلیمی اداروں کا الحاق بھی کرتا ہے۔ اس وقت متعدد ادارے اس سے ملحق ہیں انہی ملحق اداروں میں ایک ادارہ مصباح العلوم چوکنیا بھی ہے۔ دیگر ملحق اداروں کی طرح اس ادارے کے بھی امتحانات جامعہ کی زیر نگرانی ہوتے ہیں۔ اسی نگرانی کے لیے اس سال جامعہ کے لائق استاذ جناب حافظ محمد اسماعیل صاحب فلاحی تشریف لے گئے۔ آپ سے پہلے اس نگرانی کے لیے استاذ محترم جناب مولانا جمیل احمد صاحب فلاحی جایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جامعہ کے نظام تعلیم و تربیت کو مزید ترقی دے۔ آمین۔

تعمیرات

جیسا کہ اس سے پہلے آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ جامعہ اس وقت طلبہ کی کثرت کے باعث شدید تنگی کا شکار ہے۔ کچھ دنوں قبل طلبہ و طالبات کی تعلیم دو شفٹوں میں ہو رہی تھی لیکن طلبہ کے فائدے کے پیش نظر ابھی حال ہی میں تنگی کے باوجود طلبہ کی پڑھائی سابق نظام الاوقات کے مطابق دو میٹنگس یعنی ایک شفٹ میں کر دی گئی ہے کلاسوں کی کمی علی حالہ باقی ہے۔ طلبہ مسجد، ہال، ریڈنگ روم، بورڈنگ اور برآمدوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے درسگاہ کی فوری ضرورت تھی جس کے لئے ہنگامی پیمانے پر تعاون کی وصولی ہو رہی تھی، امتحانات کی وجہ سے وصولی کی یہ مہم روک دی گئی تھی۔ انشاء اللہ جلد ہی دوبارہ شروع کی جائے گی۔ نسواں میں بھی عمارت کی فوری ضرورت ہے جس کے لئے کوششیں جاری ہیں۔ اہل خیر حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔ انشاء اللہ نسواں میں بھی دو میٹنگس یعنی ایک شفٹ میں تعلیم کا انتظام جلد از جلد کر دیا جائے گا تاکہ طالبات بیش از بیش استفادہ کر سکیں۔

طلبہ کی کثرت سے مطبخ بھی تنگ دامنی کا شکار ہو گیا تھا چند دنوں قبل مطبخ میں بھی کچھ توسیع کی گئی ہے جس سے طلبہ کو کچھ مزید سہولیات میسر آگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مزید سہولیات فراہم کرے۔ آمین۔

سڑک کے کنارے جامعہ کی طرف سے دوکان اور دوکان کے اوپر اساتذہ کے لئے فیملی کوارٹرس کی تعمیر کا منصوبہ کافی دنوں سے بنا ہوا ہے لیکن دیگر ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر اس منصوبے پر عمل درآمد اب تک نہیں ہو سکا تھا۔ انشاء اللہ شوال کی ابتدا میں جلد ہی یہ کام شروع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ جامعہ کو ترقی کے اعلیٰ منازل پر پہنچائے۔ آمین۔

جناب انیس احمد صاحب فلاحی کو صدمہ

یہ خبر ہم تمام کے لئے تکلیف دہ ہے کہ جناب انیس احمد صاحب فلاحی متعلم شعبہ تخصص فی التفسیر جامعۃ الفلاح کے والد محترم ۲ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صدر محترم جناب مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی کی قیادت میں جامعہ کے ایک

وفد نے مرحوم کے جنازے میں شرکت کی۔ استاذ محترم جناب مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ قارئین حیات نو سے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان خصوصاً جناب انیس احمد صاحب کو یہ غم برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

جناب مولانا محمد الیاس صاحب

جناب مولانا محمد الیاس صاحب فلاحی کے برادر بزرگوار کی وفات

فلاحی کے برادر بزرگوار جناب محمد رضا خاں صاحب ۱۶ ستمبر ۱۹۸۸ء کو کھٹمنڈو میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موصوف کا شمار نیپال کے سیاسی و ملی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ آپ بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ عربی اور اردو ادب پر آپ کو اچھا عبور حاصل تھا۔ آپ ایک بے باک اور جرأت مند مقرر بھی تھے۔ قارئین حیات نو سے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بقیہ: حلقۂ یاراں

اسلامی ملکے صرف احتجاجات تک محدود ہیں اور اسلامی ممالک کے تعلقات ان تجارتی اداروں سے بدستور استوار ہیں۔ ان کی پیشانیوں پہ نہ کوئی شکن نہ اس "کارنامہ" کا کوئی رد عمل۔

اس جرم کا سدباب صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ تمام مسلم حکومتیں ان تجارتی اداروں سے معاشی مقاطعہ (بائیکاٹ) کر لیں۔ ان کی مصنوعات پہ پابندی عائد کر دیں اور ان ممالک سے بھی رشتہ منقطع کر لیں جن میں یہ کمپنیاں اور ادارے موجود ہیں۔

عالم اسلام کے احساس کو بیدار کرنے کے لئے اسلام دشمن طاقتوں کا جرأت مندانہ اور حقارت آمیز اقدام کافی ہے۔

والسلام

ضمیر السوی

تحریکِ اسلامی کا تنزل

اسباب اور علاج

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کے قیام سے قبل "ترجمان القرآن" میں تحریک اسلامی کے اصول و کلیات، افکار و تصورات، نصب العین، لائحہ عمل اور طریقہ کار بتاتے ہوئے اس کے خد و خال وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے۔ ساتھ ہی ساتھ ان اسباب و عوامل کی بھی نشاندہی کی جن کی وجہ سے کسی بھی دور کی تحریک اسلامی زوال و تنزل کا شکار ہو سکتی ہے۔ اسباب انحطاط و زوال کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا نے اس کے سدباب کے طریقے بھی بتلائے۔ زیر نظر کتاب میں صرف ان مباحث کے اہم اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں جو تحریک اسلامی کے تنزل، اسباب اور اس کے علاج سے متعلق ہیں۔ تحریک اسلامی کے وابستگان کے لئے ایک نہایت قیمتی، مفید اور بیش بہا کتاب ہے۔

قیمت صرف ۳/-

ادارہ شہادتِ حق

پوسٹ بکس ۹۷۰۲، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵